سہ ماہی مجلّہ

بحث و نظر

حیدرآباد

بانی

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ

مدیر

خالد سیف اللہ رحمانی

فہرست مضامین

● ● ●

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

یہ مشترکہ شمارہ جو جنوری تا جون ۲۰۲۳ء کا ہے، افسوس کہ بہ وجوہ یہ نومبر کے مہینے میں پریس میں جارہا ہے، اس وقت عالم اسلام ایک بہت ہی تکلیف دہ کیفیت سے دوچار ہے، غزہ پر اندھا دھند بمباری جاری ہے، مسلمانوں نے ایسی بے بسی شاید تاتاریوں کے عہد میں بھی نہیں دیکھی ہوگی، ایسی صورت میں ہمارا اس پر کیا ردعمل ہونا چاہئے، اس پر غور وفکر کے نتیجے میں جو بات طے کریں، اس پر ثابت قدم رہنا ہوگا، کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ہم ان ظالموں سے لاتعلقی اختیار کرلیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ. (المائدۃ:۵۱)

اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو دوست رکھے گا، وہ ان ہی میں سے ہوگا، بے شک اللہ ظلم شعار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

اس آیت میں ایک جامع لفظ ''دوست نہ بنانے'' کا استعمال کیا گیا ہے، یہ ایک معنی خیز تعبیر ہے، جس میں قلب ونگاہ کی محبت، فکر ونظر میں تاثر، سماجی زندگی کی مماثلت اور مالی معاملات وتعلقات سب شامل ہیں، یہ کوئی شدت پر مبنی حکم نہیں ہے؛ بلکہ ظلم کے خلاف ناراضگی کے اظہار کا ایک طریقہ ہے، اس آیت کے اخیر میں ظالموں کا تذکرہ کرکے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ جو یہود ونصاریٰ ظلم وجور پر کمربستہ ہوں، مسلمانوں کے لئے اپنی طاقت وقدرت کے مطابق ان سے بے تعلقی برتنا واجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور موقع پر اس حکم کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، ارشاد ہے:

إِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُم مِّن

دِيَارِكُمْ وَظَاهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَن تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (الممتحنہ:۹)

بے شک اللہ تم کو ان لوگوں سے تعلق رکھنے سے منع کرتے ہیں، جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی، تم کو تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی اور جو ان سے تعلق رکھیں، وہ بھی ظالم ہیں۔

گھروں سے نکالنا، محض دین کی بنا پر آمادۂ قتل وقتال ہونا اور جو لوگ مسلمانوں کے شہروں اور آبادیوں کو ویران کرنے پر تلے ہوئے ہوں، ان کو مدد پہنچانا، یہ وہ اوصاف ہیں جن کے حامل بدطینت یہودیوں اور نصرانیوں سے بے تعلقی برتنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا گیا:

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. (الممتحنہ:۸)

اللہ تعالیٰ تمہیں ان غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف سے نہیں روکتا، جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہ کی ہو اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

جو غیر مسلم بھائی انصاف کی روش پر قائم ہوں، وہ ہمارے انسانی بھائی ہیں اور ہمارے برادرانہ سلوک اور حسن اخلاق کے مستحق ہیں اور ان کے ساتھ زیادتی کسی طور جائز نہیں، —— بے تعلقی کا حکم ان لوگوں سے ہے، جنھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جارحانہ اور نامنصفانہ روش اختیار کر رکھی ہو، یہ سمجھنا کہ کسی خاص مطالبہ کی تکمیل مغربی طاقتوں کو مطمئن کردے گی اور اسلام کے خلاف بغض وعناد کی جو آگ ان کے سینوں میں لگی ہوئی ہے، اسے بجھانے میں کامیاب ہوجائے گی، محض ایک طفلانہ خیال ہے، اس عناد کا اصل نشانہ اسلامی فکر وعقیدہ، اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلمانوں کا قبلۂ اول مسجد اقصیٰ ہے، قرآن نے یہود ونصاریٰ کی نفسیات اور ان کے اندرونی جذبات کی خوب ترجمانی کی ہے اور یہ بات جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں مبنی برواقعہ تھی، اسی قدر آج بھی ہے کہ:

وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ. (البقرۃ:۱۲۰)

یہود ونصاری آپ سے اس وقت تک راضی ہو ہی نہیں سکتے، جب تک آپ ان کے دین کے پیرو نہ ہو جائیں، آپ کہہ دیجئے کہ ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی ہے، اگر آپ علم حاصل ہونے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کرنے لگیں تو آپ کے لئے اللہ کے مقابلہ کوئی حامی ومددگار نہ ہوگا۔

قرآن نے اس میں یہود ونصاریٰ کے اندرونی جذبات کو کھول کر رکھ دیا ہے اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے اب تک عالم اسلام میں جو جنگیں ہوئی ہیں، وہ سب اس کے واضح شواہد ہیں، اس لئے جب تک مسلمان اپنے مذہبی تشخصات اور اپنے ثقافتی امتیازات کو خیر باد نہ کہہ دیں، مسجدِ اقصیٰ سے اور اپنے مقدسات سے دستبردار نہ ہو جائیں، اور پوری طرح مغربی فکر اور مغربی ثقافت کے سامنے جبینِ تسلیم خم نہ کر دیں، ان کی تشفی نہیں ہوسکتی اور ان شاء اللہ مسلمان کبھی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے؛ اس لئے کہ وہ دین کے لئے سب کچھ کھونے کو ''پانا'' اور اللہ کی راہ میں رگِ گلو کٹانے کو ''جینا'' تصور کرتے ہیں اور یہ ان کے ایمان وعقیدہ کا حصہ ہے!

اس پس منظر میں ہم مسلمانانِ ہند قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے یہ ضرور کر سکتے ہیں ملک کی رائے عامہ کو حقیقت پسند بنائیں اور انھیں حقیقی صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مدد دیں، منصف مزاج ہندو بھائیوں (جن کی آج بھی اس ملک میں اکثریت ہے) کو ساتھ لے کر حکومت ہند سے خواہش کریں کہ وہ اپنی ناوابستہ پالیسی پر قائم رہے اور امریکہ واسرائیل کی آنکھ بند کر کے حمایت نہ کرے، وہ اس بات کو ملحوظ رکھے کہ ہمارے ملک کا مفاد عربوں کے ساتھ بہتر تعلق میں ہے، نہ کہ اسرائیل جیسے خود غرض اور قلاش ملک کی تائید میں۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم امریکہ اور اسرائیل کی تجارتی اشیاء کا بائیکاٹ کریں، جس کی فہرستیں بھی اخبارات اور سوشل میڈیا میں آچکی ہیں، کہ یہ بھی منکر پر ناراضگی کے اظہار اور ظالم سے بے تعلقی برتنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے، اور شرعاً بہ حیثیت مسلمان ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ اس سلسلہ میں جو طریقہ اختیار

کرنا ہمارے لئے ممکن ہو، ہم اس سے دریغ نہ کریں، بعض حضرات کہتے ہیں کہ صرف مسلمانوں کے بائیکاٹ کرنے سے ان کا کیا نقصان ہوگا؟ یہ درست نہیں ہے، اول تو اگر مسلم ممالک بھی اس بائیکاٹ میں شامل ہو جائیں تو اس کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوں گے، دوسرے: مسئلہ صرف ان کو نقصان پہنچنے اور پہنچانے کا نہیں ہے؛ بلکہ اپنی طرف سے اظہارِ ناراضگی کا ہے، کتنے ہی واقعات پیش آتے ہیں کہ خاندان میں اختلاف پیدا ہوا اور اس کی وجہ سے ایک دوسرے کی دعوت میں شرکت سے گریز کرنے لگے، یہاں تک کہ بعض اوقات بات چیت بھی بند ہو جاتی ہے؛ حالاں کہ معلوم ہے کہ اس کے دعوت میں شریک نہ ہونے اور بات نہ کرنے سے دوسرے شخص کا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے؛ لیکن مقصود اپنے جذبات کا اظہار ہوتا ہے، یہی جذبہ یہاں بھی ہونا چاہئے ،غرض کہ یہ انسانی فریضہ ہے، کیا ہم اس کے لئے بھی تیار نہیں ہیں؟!

۱۳/ جمادی الاول ۱۴۴۵ھ — خالد سیف اللہ رحمانی

۲۸/ نومبر ۲۰۲۳ء — (بیت الحمد، شاہین نگر، حیدرآباد)

دینی وتہذیبی شناخت کی حفاظت
وقت کا اہم مسئلہ

خالدسیف اللہ رحمانی

یہ استاذ گرامی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا وہ فکر انگیز کلیدی خطبہ ہے، جو انھوں نے ۱۸/نومبر ۲۰۲۳ء، ۳/جمادی الاولیٰ ۱۴۴۵ھ کو جامعۃ الاسوۃ الحسنۃ، شریعت کالج، پلاپٹی ضلع کرور، تمل ناڈو میں اسلامک فقہ اکیڈمی کے ۳۲/ویں سالانہ فقہی سیمینار میں پیش کیا تھا، اس کا تعلق موجودہ دور میں ملت اسلامیۂ ہند کے ایک اہم مسئلہ سے ہے، جو تمام علماء، اہل دانش اور فکر مند مسلمانوں کے لئے لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے، اسی نقطۂ نظر سے اس خطبہ کو یہاں شامل کیا جارہا ہے۔ (عبیداختر رحمانی)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونتوب إليه ونتوكل عليه ونصلي ونسلم على سيد المرسلين محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين.

صدر عالی قدر، حضرات علماء کرام، فقہاء ذی احترام!

آج پھر ۲۸/فروری تا ۲/مارچ ۲۰۰۹ء کی وہ تاریخ یاد آتی ہے، جب اکیڈمی کا اٹھارہواں سیمینار تامل ناڈو کے اسی شہر پلاپٹی سے قریب مدورائی میں ہوا تھا، اس وقت ادارہ کے موجودہ ذمہ داروں کے علاوہ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب باقویؒ رونق افروز تھے، اور ان ہی کی سرپرستی میں اس پروگرام کا انعقاد عمل میں آیا تھا، اس وقت حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب مدراسی قاسمیؒ بھی پروگرام کی اہم شخصیتوں میں تھے، جن کی رفاقت درس کا مجھے شرف حاصل ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگوں کی بال بال مغفرت فرمائے، آخر یہ قافلہ ملک کے مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا اب پھر اسی خطہ میں خیمہ زن ہے، گزشتہ ۳۵/

سالوں سے اکیڈمی کا یہ کاروانِ فکر وفن اسی طرح مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے اپنے کام کو انجام دے رہا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مستقبل میں بھی اس کے سفر کو ہمیشہ جاری وساری رکھے۔

حضرات ! اس وقت ملک کے جو حالات ہیں اور مسلمان جس صورت حال سے دو چار ہیں، وہ دو پہر کی روشنی کی طرح واضح ہے، کہیں اسلامی شعائر کی اہانت، کہیں مسلم نوجوانوں کی ماب لنچنگ، کہیں مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ اور کہیں دوسرے رسوا کن واقعات پیش آرہے ہیں، اور ان سب سے بڑھ کر وہ نفرت انگیز پروپیگنڈہ ہے، جس کے ذریعہ برادران وطن کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف آگ سلگا دی گئی ہے، بے برداشتگی کا ماحول پروان چڑھ رہا ہے، اور منظّم طور پر اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے، ضرورت ہے کہ پوری گہرائی کے ساتھ اس صورت حال کو سمجھا جائے، اور موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے درست لائحہ عمل کی نشاندہی کی جائے، اسلامک فقہ اکیڈمی کا موضوع تو دور جدید میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا حل ہے؛ لیکن فکری پہلو سے مسلمانوں کو جو مسائل درپیش ہیں، اکیڈمی نے ہمیشہ ان میں بھی رہنمائی کی کوشش کی ہے، اگر غور کیا جائے تو اس سیمینار کے عناوین میں جو ''تشبہ'' کا موضوع رکھا گیا ہے، وہ اس پہلو سے بڑا اہم ہے، جو موجودہ حالات میں اپنی ملی وتہذیبی شناخت کی حفاظت کی طرف متوجہ کررہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ بھارت کی سرزمین نے دنیا کے مختلف مذاہب کا استقبال کیا ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مشرکانہ سوچ اور تہذیب یہاں کے رگ وریشہ میں رچی بسی ہے، اور اس سے بھی زیادہ دشوار بات یہ ہے کہ اس ملک کے ایک طبقہ نے دیگر مذاہب وافکار اور تہذیب وتمدن کو اپنے وجود میں جذب کرنے کی پُرفریب اور کامیاب کوشش کی ہے۔

مذہبی شدت پسندی اور مخالف فکر کو برداشت نہ کرنے کا جذبہ انسان کو اس طرف لے جاتا ہے کہ وہ دوسرے نظریہ کو ختم کردے، اس کی سب سے خطرناک صورت یہ ہے کہ دوسری فکر پر یقین رکھنے والوں کو مذہب بدلنے پر مجبور کردیا جائے، اور نہ ماننے کی صورت میں کوئی رحم کھائے بغیر تہہ تیغ کردیا جائے، اس کی مثال قدیم تاریخ میں بھی ملتی ہے، قرآن مجید میں کم از کم اس طرح کے دو واقعات پوری وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ فرعون نے بنی اسرائیل کو عقیدۂ توحید سے روکنے کے لئے نسل کشی کی تدبیر اختیار کی کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بیٹا پیدا ہوتا، اسے قتل کردیا جاتا، نہ جانے کتنے بچے فرعونِ وقت کے اس ظالمانہ حکم کا شکار ہوئے [۱]،

---

(۱) تفسیر السمعانی: ۱/۷۷، بقرہ: ۴۹

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ جو مذہبی منافرت کی بناء پر تشدد اور بے برداشت ہونے کا ہے، وہ ہے جسے ’’اصحاب اخدود‘‘ کہا جاتا ہے، یہ حق پرست عیسائیوں کا واقعہ ہے، جن کو جیتے جی نذر آتش کرنے کے لئے ایک بڑی کھائی کھودی گئی اور کم وبیش ۲۰/ ہزار افراد اس میں زندہ جلا دیئے گئے [(۱)]، اسلام کے ابتدائی دور میں بھی بعض ایسے واقعات پیش آئے، جن میں بئر معونہ کے واقعہ میں ستر حفاظ صحابہ کی شہادت کا واقعہ نا قابل فراموش ہے [(۲)]، اور ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک رومی سردار نے کئی مسلمانوں کو توحید پر قائم رہنے کے جرم میں تیل کی کڑاہی میں تل دیا؛ مگر ان کے پایۂ استقامت میں کوئی جنبش تک نہیں آئی۔ [(۳)]

اہل یورپ میں مذہبی شدت پسندی بہت زیادہ تھی، دنیا کی آنکھوں نے ماضی قریب تک اس کی مثالیں بار بار دیکھی ہیں، انھوں نے سرد جنگ میں فتح پانے کے بعد فلسطین میں جو مظالم ڈھائے، وہ تاریخ کا ایک خونچکاں باب ہے، پھر یہ عیسائی شدت پسند ہی تھے، جنھوں نے یہودیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے ہولو کاسٹ (Holocaust) کیا، اور بے شمار یہودی گیس کے چیمبروں میں ایک ایک قطرۂ آب کو ترستے ہوئے مار ڈالے گئے [(۴)]، یہ مغرب ہی ہے، جس نے اندلس کے مسلمانوں کو دھوکہ دے کر سمندر میں غرق کر دیا، اور اپنے عہد کا کوئی پاس نہیں رکھا، اور ہزاروں مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے شہید کر دیا؛ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ اسپین سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جائے [(۵)]، مغرب نے سائنس وٹکنالوجی کی طاقت حاصل کی، اس کو بھی انھوں نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے مخالفین کو بے نام ونشان کرنے کے لئے استعمال کیا، جس کی مثال دوسری جنگ عظیم میں جاپان کے دو آباد اور بھرے پُرے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر نیوکلیئر بم کی بارش ہے، جس نے لاکھوں لوگوں کو لقمۂ اجل بنا دیا، اور دور کیوں جائیں، بوسنیا کے قتل عام کا تصور کیجئے اور شام اور عراق میں شہداء کی پاکیزہ روحوں کو یاد کیجئے کہ کس طرح خون انسانی کی ارزانی کا تماشہ مشرق سے لے کر مغرب تک ساری دنیا نے دیکھا، غرض کہ کسی مذہب کی پیش قدمی یا کسی قوم کی بالا دستی کو روکنے کے لئے تشدد کی بہت قدیم تاریخ رہی ہے، آر ایس

---

(۱) قصص القرآن: ۳/ ۲۲۳

(۲) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الرجیع وبئر معونۃ، حدیث نمبر: ۴۰۸۸

(۳) شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر: ۱۶۳۹، ۲/ ۲۴۴

(۴) مرگ انبوہ، دائرۃ المعارف برٹانیکا، ۲۰۰۷

(۵) خلافت اندلس نواب ذو القدر جنگ بہادر: ۴۲۴

ایس کے بانیوں اور رہنماؤں نے بھی بھارت کی اقلیتوں کے بارے میں اسی برتاؤ کی دعوت دی ہے(۱)، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کی پیش قدمی کو طاقت کے ذریعہ روک دیا جائے اور اپنے مقابل کسی اور مذہب اور سوچ کو برداشت نہ کیا جائے۔

حضرات! کسی مذہبی گروہ کو ختم کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فکری وتہذیبی طور پر ان کو اپنے وجود میں جذب کرلیا جائے ، اس کی واضح مثال موجودہ عیسائیت ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبیٔ برحق تھے، اور انھوں نے انسانیت کو توحید کی دعوت دی تھی ،مگر یہودیوں نے ان کے متبعین پر بڑے مظالم ڈھائے ، یہاں تک کہ وہ فلسطین سے نکل کر مختلف جگہوں پر بھٹکنے پر مجبور ہو گئے ،عیسائیوں پر جوروستم کے لئے اکسانے والوں میں سے ایک اہم شخصیت راسخ العقیدہ یہودی پولس (POLUS) کی تھی ، جو سینٹ پال (Saint Paul) کے نام سے جانا جاتا ہے، اس نے جب دیکھا کہ تشدد کا ہتھیار کام نہیں آرہا ہے تو اس نے عیسائیت پر فکری پہلو سے شب خوں مارا، اس زمانہ میں دنیا کی مختلف قوموں میں تثلیث ، یعنی تین خداؤں کا عقیدہ رکھتی تھیں، خود ہمارے ملک میں برہما، وشنو، شیو کے خدا ہونے کا تصور موجود تھا اور اب بھی ہے، فلسطین کے قریب روم و یونان میں بھی تثلیث کا تصور موجود تھا، اور تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے۔

سینٹ پال نے مخلصانہ یا منافقانہ طور پر عیسائیت قبول کرنے کے بعد عیسائیت کو روم و یونان میں مقبول بنانے کے لئے اس کو تثلیث کے سانچے میں ڈھال دیا ، اور اس کے لئے باپ ، بیٹا اور روح القدس کی اصطلاح ایجاد کی ،جس کی خود انجیل میں کوئی صراحت نہیں ہے، آخر عیسائیت کا وجود ہمیشہ کے لئے تثلیث میں گم ہو کر رہ گیا، اگر قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح نہیں کیا ہوتا، تو شاید کبھی اس جھوٹ سے پردہ نہیں اٹھ پاتا، اسی طرح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور آپؐ نے اہل مکہ کو بت پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت دی تو پہلے تو انھوں نے طاقت کے ذریعہ اس کو ختم کرنے کی کوشش کی ، لیکن جب ان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس میں کامیاب نہیں ہوں گے تو صلح کا ایک فارمولہ پیش کیا ، اور وہ یہ کہ ہم لوگ بھی مسلمانوں کے خدا کو تسلیم کرلیں اور اس کی عبادت کریں اور مسلمان بھی ہماری دیویوں دیوتاؤں کو خدا مان لیں اور وہ بھی ان کی پوجا کریں ، نیز ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں کے لئے ایک ایک سال مقرر کرلیں ، ایک سال ہماری دیویوں دیوتاؤں کی عبادت کا رہے اور ایک سال مسلمانوں کے خدا کی عبادت کا ہو، اسی پس منظر میں

(۱) بھگوا دہشت گردی اور مسلمان ، از اعظم شہاب الدین: ۳۹، ساورکر؛ فکر وتحریک: ۳۱

''سورۂ کافرون'' نازل ہوئی(۱)، یہ بظاہر صلح کی ایک کوشش تھی؛ لیکن درحقیقت یہ مسلمانوں کو اپنے وجود میں جذب کرنے کی سازش تھی، قرآن مجید میں صاف طور پر اس نقطۂ نظر کو رد کر دیا گیا اور واضح کر دیا گیا کہ توحید اور شرک دو متضاد چیزیں ہیں، یہ ایک شخص میں جمع نہیں ہوسکتی ہیں، ممکن نہیں کہ ایک انسان بیک وقت ایک خدا کی بھی عبادت کرے اور بہت سارے خداؤں کی بھی۔

اس پس منظر میں اگر ہم اپنے ملک کی تاریخ کو دیکھیں تو واضح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ موجودہ ''ہندوتوا'' کی ترجمانی کرنے والا برہمن گروہ بہت ہی گہری اور شعوری کوششوں کے ساتھ مخالف نقطۂ نظر کو اپنے راستے سے ہٹا کر اس کو مشرکانہ سوچ میں ضم کر دیتا ہے، بودھ اصل میں توحید کے قائل تھے اور خدا کو ''علۃ العلل'' اور کائنات کا اصولِ اول قرار دیتے تھے، گوتم بدھ کی اصل دعوت برہمنوں کے اس تصور کو ختم کرنا تھا کہ پیدائشی طور پر کوئی انسان برتر اور کوئی کمتر ہے، برہمنوں کی من گھڑت رسموں سے نجات حاصل کرنا بودھ کی بنیادی تعلیمات کا حصہ تھی؛ اسی لئے برہمنیت کی طرف سے ان کی تحریک پر کفر کا فتوی لگا اور اس فرقہ کو ناستک، یعنی ملحد قرار دیا گیا، برہمنوں نے ان کے مندر توڑ ڈالے، ہزاروں لوگوں کو قتل کر ڈالا، مگر جب راجہ اشوک نے بودھ مذہب قبول کیا تو یہ اس خطہ کا غالب اور مقبول مذہب بن گیا، اور یہاں سے چین، جاپان، سری لنکا، کوریا، ویتنام اور تھائی لینڈ تک پھیل گیا، لیکن بالآخر ہوا یہ کہ جب ۱۲۰ ؍عیسوی میں راجہ کنشک تخت حکومت پر بیٹھا تو اس نے مہاتما بودھ کو خدا کا اوتار مان کر لوگوں کو ان کی مورتی کی پوجا کرنے پر آمادہ کر لیا، اور اس طرح ایک ایسا مذہب جس کی بنیاد اللہ کی توحید اور انسانی وحدت پر تھی، شرک کے رنگ میں رنگ گیا، اب گوتم بودھ کی پرستش بودھ سماج کا ایک لازمی حصہ بن چکی ہے، اور اُن کی بڑی بڑی مورتیاں بنائی جا رہی ہیں، یہاں تک کہ آج ہمارے ملک میں بودھ ہندو سماج کا حصہ بن گئے ہیں، اور بڑی چالاکی کے ساتھ ملک کے دستور میں بھی ان کو ہندو قرار دے دیا گیا ہے، اسی کی ایک مثال جین مت ہے، جو ایک بڑا فلسفیانہ مذہب ہے، اس کے دو بڑے فرقے ہیں، ایک دگامبر جو بے لباس رہتے ہیں، دوسرے: شوتامبر جو سفید کپڑے استعمال کرتے ہیں، یہ دونوں بنیادی طور پر بت پرستی کے مخالف ہیں، اس قوم کو مجسمہ سازی کے فن میں امتیاز حاصل رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایلورا اجنتا کے مندر ان ہی کی فنکاریوں کا نمونہ ہیں، جینیوں کو بھی آہستہ آہستہ پوری طرح مشرکانہ رنگ میں رنگ دیا گیا اور خود مہاویر جین کی مورتی پوجا پر ان کو آمادہ کر لیا گیا، آج یہ بھی ہندو سماج کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

---

(۱) روح المعانی: ۱۵؍ ۴۸۵

اسی کی ایک مثال سکھ مت ہے، اس مذہب کے بانی گرونا نک جی کا زمانہ زیادہ دور نہیں ہے، وہ ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے، وہ شروع سے توحید پر عامل تھے، اور بت پرستی سے دور رہتے تھے، انھوں نے جومول منتر یعنی بنیادی کلمہ سکھایا، اس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ خدا ایک ہے، اس کا نام سچ ہے، وہی قادر مطلق ہے، وہ بے خوف ہے، اسے کسی سے دشمنی نہیں ہے، وہ ازلی وابدی ہے، بے شکل وصورت ہے، قائم بالذات ہے (۱)، یہ تحریک دراصل برہمنی رسوم ورواج کو ختم کرنے کے لئے شروع ہوئی تھی؛ اسی لئے سکھوں کے چوتھے گرورام داس نے شادی اور مرنے کی رسوم ہندو مذہب سے الگ مقرر کیں، ستی کی رسم کی مخالفت کی اور بیواؤں کی شادی پر زور دیا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گرونا نک جی اسلام سے زیادہ متأثر تھے، انھوں نے پانچ نمازیں پڑھنے کا حکم دیا، روزہ رکھنے کی تلقین کی، ختم نبوت پر ایمان لانے کو کہا، رسول اللہ ﷺ کی اپنے کلام میں جا بجا ستائش کی اور اسلامی تعلیمات کو سراہا؛ مگر افسوس کہ سیاسی اختلافات اور اس سے پیدا ہونے والے جنگ وجدال نے ان کو مسلمانوں سے دور کر دیا، آہستہ آہستہ سکھ سماج کو موجودہ ہندو سماج کا حصہ بنا دیا گیا اور سکھوں کے انکار کے باوجود بہت ہی ڈھٹائی کے ساتھ دستوری طور پر ان کو بھی ہندوؤں میں شامل کر لیا گیا۔

حضرات! ہندو مذہب کے متکلمین نے زیادہ سے زیادہ قوموں کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ خداؤں کی تعداد کو بڑھایا جائے، کہا جاتا ہے کہ اصل ہندو مذہب میں ایک ہی خدا کا تصور تھا؛ چنانچہ مذہب اور تہذیب کے مشہور محقق اور مؤرخ ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

> ایک خدائے مطلق کا خیال جو تمام فانیوں اور غیر فانیوں کا خالق اور تمام انسانوں، پتروں اور دیوتاؤں پر حاکم ہو، رگ وید میں بے شک پایا جاتا ہے؛ لیکن محض ایک خاکہ کی صورت میں۔ (۲)

یہ ایک سے تین اور تین سے تینتیس ہوئے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی تعداد تینتیس (۳۳) کروڑ تک پہنچ چکی ہے؛ چنانچہ ایک ہندو محقق لکھتے ہیں:

> پھر یہ تعداد بڑھ کر تینتیس کروڑ تک پہنچ جاتی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ دیوتاؤں کی بے شمار تعداد زندگی اور فطرت پر حکومت کر رہی ہیں؛ لیکن یہ بنیادی تصور کہ

---

(۱) ہندوستانی مذاہب، ڈاکٹر رضی کمال، ص: ۶۳

(۲) تمدن ہند، ص: ۲۶۱

ایک خدا ارتقاء کر کے تین بن گئے، پھر تینتیس اور پھر روحانی قوت کے لاتعداد
پہلوؤں میں تبدیل ہو گئے، منظر سے کبھی اوجھل نہیں ہوا۔ (۱)

دیوتاؤں کی اس کثرت کا یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ مختلف گروہوں کے پیشواؤں کو خدا کے اوتار کا درجہ دے کرانہیں بھی ہندوقوم میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی، آریوں نے دراوڑیوں پر پہلے بڑے مظالم ڈھائے اور ان کو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی؛ لیکن جب اس میں پوری کامیابی نہیں مل سکی تو ان کو ہندوقوم کا حصہ بنانے کے لئے دراوڑ جن مورتوں کی پوجا کرتے تھے، ان کو اپنے معبودوں میں شامل کرلیا گیا، اہل علم جانتے ہیں کہ ایک زمانہ میں بعض ہندو لیڈروں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ مل جائیں، ہم محمد ﷺ کو بھی ایک اوتار مان لیتے ہیں، شاید اسی کوشش کا ایک حصہ یہ بھی ہو کہ ہندو مذہبی رہنماؤں نے کبھی ہندو مذہب کے عقائد وافعال متعین کرنے اور ہندوقوم کی حدود اربعہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، کسی نے کہا جو ہندو ماں باپ سے پیدا ہو، وہ ہندو ہے، چاہے دھرم شاستروں کا عقیدہ رکھتا ہو یا نہیں، اسی معنی میں پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی ہندو مانا گیا ہے، کسی نے کہا جو سندھو دریا کے اس پار پیدا ہوا ہو، وہ ہندو ہے، کسی نے کہا کہ جو کسی اور مذہب کو ماننے والے نہ ہوں اور ہندوستان اس کی جائے پیدائش ہو، وہ سب ہندو ہیں، یا یہ کہا گیا کہ جس کو ہندو ہونے سے انکار نہ ہو، وہ ہندو ہے، اسی پس منظر میں سنگھ پریوار کے موجودہ رہنما موہن بھاگوت بعض دفعہ ملک کے تمام باشندوں کو ہندو قرار دیتے ہیں؛ کیونکہ ان کے آباء واجداد سب ہندو تھے، ہندو مذہب اور ہندوقوم کی غیر متعین تعریف کو بہت سے ہندو علماء ہندو مذہب کی وسعت قرار دیتے ہیں؛ مگر حقیقت میں کسی چیز کی حقیقت کا متعین نہ ہونا اور اس میں ناقابل وضاحت ابہام کا پایا جانا کوئی قابل تعریف بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک عیب ہے، جو اس تصور کے بے حقیقت ہونے کو ظاہر کرتا ہے، یہ ایسا ہی ہے کہ کسی وجود کے بارے میں کہا جائے کہ یہ کتا بھی ہے، گدھا بھی ہے، گھوڑا بھی ہے، اس کا نامعقول ہونا ظاہر ہے؛ مگر برہمنوں نے اس کا فائدہ یہ اٹھایا کہ انھوں نے بہت سے غیر ہندو گروہوں کو ہندوقوم کا حصہ بنا دیا۔

ایسا نہیں سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں کو اس کا نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی گئی، آزادی سے پہلے جو آخری مردم شماری ہوئی اس میں بہت سے لوگوں نے مذہب کے خانہ میں اپنے آپ کو ''محمدی ہندو'' قرار دیا، سندھ کی بعض برادریوں کو ''حسینی برہمن'' کہا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ عجمی مسلمانوں اور خاص کر برصغیر کے مسلمانوں

---

(۱) The cultural heritage of india، ص:۹۸

میں مشرکانہ رسوم جس کثرت سے پائی جاتی ہیں، نظریہ کے اعتبار سے بھی نبی اور اولیاء میں خدائی صفات کو مانا جاتا ہے اور عملی زندگی میں بھی مخلوقات کے ساتھ غلو آمیز تقدس کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ شرک صریح کا ارتکاب کیا جاتا ہے، اس کے پیچھے برادران وطن سے تأثر کارفرما ہے، اسی لئے اس ملک میں جن شخصیتوں نے تجدیدی کارنامہ انجام دیا، مجدد الف ثانیؒ سے لے کر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تک سب نے عقیدۂ توحید کو بے غبار کرنے اور مسلمانوں کو مشرکانہ رسوم و عادات اور افکار وتصورات سے بچانے پر سب سے زیادہ توجہ دی، اکبر کے دربار میں ہندو عالموں اور فلسفیوں کا غلبہ اور دینِ الٰہی کی ایجاد اور پھر گیتا کے شارح دارا شکوہ کے افکار اور منجانب اللہ اورنگ زیبؒ کی فتح مندی اور ہندو مذہبی مقدسات کے ساتھ ان کے فراخدلانہ عطیات اور حسن سلوک کے باوجود سنگھی مصنفین کے یہاں اورنگ زیب کی مذمت اور اس کے کارناموں کو نظر انداز کرنا یہ دراصل اسی بنیاد پر ہے کہ مسلمانوں کو ہندو تصور اور تہذیب میں جذب کرنے کی جو کوشش ہو رہی تھی، جس کے خلاف مجدد الف ثانیؒ نے پوری قوت کے ساتھ آواز اٹھائی تھی، اورنگ زیب عالمگیرؒ نے سیاسی قوت کے ذریعہ اس کو پوری قوت کے ساتھ کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا۔

ملک کی آزادی میں مسلمان پیش پیش تھے؛ حالانکہ اس تاریخ کو مٹانے کی بہت کوشش کی جا رہی ہے؛ لیکن انڈیا گیٹ ایک واضح ثبوت بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہے، جس میں مجاہدین آزادی کے نام کندہ کئے گئے ہیں، اور ان میں ۶۰ رفیصد سے زیادہ مسلمانوں کے نام ہیں، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ آر ایس ایس کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں ہو چکی تھی اور ان کی کوشش تھی کہ ہندوستان کا دستور خالصۃً اس تصور پر مبنی ہو، جس کو ان لوگوں نے ہندوتوا سے تعبیر کیا ہے، اور جو اس وقت ایک حد تک اکثریتی گروہ کے لئے سب سے زیادہ مقبول فکر ہے؛ لیکن مختلف گروہوں اور خاص کر مسلمانوں کی جنگ آزادی میں شرکت نے اس کوشش کو ناکام بنا دیا، خود ڈاکٹر بی آر امبیڈکر برہمنیت کے مخالف، بلکہ اس کے باغی تھے، دستور ساز کونسل میں مختلف مسلم قائدین بھی تھے، اور جواہر لال نہرو جیسے سیکولر اور ایک حد تک کمیونسٹ ذہن رہنما جیسے افراد بھی اس میں شامل تھے؛ اس لئے ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی، اور پھر ہندوتوا فلسفہ سے متاثر مجرمانہ ذہن کے حامل ایک شخص ناتھورام گوڈسے نے جب گاندھی جی کا قتل کر دیا تو اس سے وقتی طور پر پورا ماحول بدل گیا، اور لوگوں پر اس گروہ کا اصل مزاج واضح ہو گیا، اس سے ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں، اب ملک کے موجودہ حالات میں مختلف جہتوں سے مسلمانوں کو مرعوب، بے وزن اور فکری اعتبار سے کمزور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے؛ تاکہ خدانخواستہ ان کو

ذہنی ارتداد کی طرف لایا جاسکے، اس کے لئے تخویف وترہیب اور ترغیب وتحریص دونوں طریقے اختیار کئے جارہے ہیں، جو کئی شکلوں میں سامنے آرہا ہے، مسلم آبادیوں سے جلوس لے جانے کی کوشش اور مسجدوں کی بے حرمتی، مسلمانوں کا ہجومی قتل بالخصوص غریب مسلمان تاجروں، آٹو ڈرائیوروں کو نشانہ بنانا، اسکولوں میں پڑھنے والے مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کو رسوا اور ذلیل کرنا، مسلم عورتوں کو نشانہ بنا کر بے آبرو کرنا، آئے دن اس طرح کی خبریں اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔

مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے کمزور سے کمزور تر کرنے کی کوشش بھی جاری ہے، سرکاری ملازمتوں کا دروازہ بڑی حد تک مسلمانوں پر بند تھا؛ البتہ کچھ پرائیویٹ ملازمتیں مسلمانوں کو مل جاتی تھیں، خاص کر آئی ٹی سیکٹر کی ترقی اور غیر ملکی تجارتی کمپنیوں کی آمد کی وجہ سے مسلم نوجوانوں کو روزگار کے کچھ بہتر مواقع حاصل ہورہے تھے، اب اس پر بھی روک لگانے اور کمپنیوں کو مسلمان ملازم نہ رکھنے کا پابند کیا جارہا ہے، کچھ باہر کے ملکوں کی ملازمت اور کچھ پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمت کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر ہورہی تھی، انھوں نے تجارت کے میدان میں بھی قدم رکھنا شروع کیا ہے، یہ بات فرقہ پرست طاقتوں کو بہت کھل رہی ہے، انھوں نے مسلمانوں کی دکانوں کا بائیکاٹ کرنے ؛ یہاں تک کہ مسلم مزدوروں سے کام نہ لینے کی بھی اپیل کی ہے، مسلمانوں کو سیاسی طور پر بے وزن کرنے کی صورت حال یہ ہے کہ مسلم امیدوار کسی بھی پارٹی سے، یہاں تک کہ فرقہ پرست جماعت ہی سے کیوں نہ کھڑا ہو، غیر مسلم اسے ووٹ نہیں دیتے ہیں، مسلم مُکت وزارت، پارلیمنٹ اور اسمبلی بنانے کی دعوت دی جارہی ہے، اور اس پر پوری شدت کے ساتھ عمل بھی ہورہا ہے۔

یہ تو امن وامان، معیشت وسیاست کا پہلو ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مذہبی پہلو سے دوطرفہ حملہ ہے، ایک یہ کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی بھرپور سعی ہورہی ہے، میڈیا کے ذریعہ جھوٹ اور فریب پر مبنی ایسے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں، جو اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کریں، اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے، اپنے آپ کو سیکولر کہنے کے باوجود اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کو ملک مخالف بنا کر پیش کیا جاتا ہے، میڈیا کے علاوہ تعلیم کے راستہ سے بھی اسلام اور مسلمانوں کو مطعون کرنے کی مسلسل کوششیں ہورہی ہیں، نصابِ تعلیم سے مسلمانوں کے پورے عہد کو نکال دیا گیا ہے، ملک کی تاریخ بدلی جارہی ہے، اور کہا جارہا ہے کہ ہندوستان ۱۹۴۷ء میں دوسو سال کی نہیں ؛ بلکہ دو ہزار سال کی غلامی سے آزاد ہوا ہے، نصابِ تعلیم میں مسلمانوں کو ڈاکو اور قاتل کی حیثیت سے پیش کیا جارہا ہے، ایک طرف یہ ساری تدبیریں مسلمانوں کو کمزور اور بے وزن کرنے اور

احساس کمتری میں مبتلا کئے جانے کے لئے ہو رہی ہیں ،دوسری طرف مختلف جہتوں سے ہندو مذہبی افکار اور تہواروں کا تقدس سرکاری طور پر ذہن میں بٹھایا جارہا ہے،اسکولوں میں مشرکانہ ترانہ وندے ماترم پڑھنے پر زور دیا جارہا ہے،اسکولوں میں گیتا کی تعلیم کولازم کیا جارہا ہے،اوراس کونیشنل بک قراردیا جارہا ہے،یوگا کے نام پر سوریانمسکاراور ہندوانہ تہذیب پر مسلمانوں کومجبور کیا جارہا ہے، بھارت ماتا کی مورتی بنائی جارہی ہے،اوراس کی جے کارلگائی جارہی ہے، نہ صرف گائے کومقدس جانور کے طور پر پیش کیا جارہا ہے؛ بلکہ اس کے گوبراور پیشاب کوبھی اشیائے تبرک کارنگ دیا جارہا ہے،سرکاری تقریبات میں ہندوعلامتی اشیاء کا استعمال ہورہا ہے،جس کا بھرپور مظاہرہ پارلیمنٹ کے افتتاح کے موقع پر ہوا،عمارتوں کوبھی قدیم ہندوطرز تعمیر پرڈیزائن کیا جارہا ہے، ہندودھرم کی نسبت سے سنسکرت زبان کومسلط کرنے کی کوشش ہورہی ہے، اسکولوں میں مسلمان طلبہ وطالبات سے سرسوتی پوجا کرائی جارہی ہے، تعلیمی اداروں میں درگا پوجا کا تہوار رکھا جارہا ہے، آیورویدک دواؤں کو ہندو مذہبی تعلیمات کے طور پر پیش کر کے فروغ دینے کی جان توڑ کوشش ہورہی ہے، فلموں کے ذریعہ ہندو دیویوں دیوتاؤں کی عظمت ظاہر کی جارہی ہے،اور بہت افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کوگمراہ کرنے کی یہ منظم سازشیں کسی حد تک رنگ بھی لارہی ہیں، ہندوتہواروں میں مسلمانوں کی شرکت ،غیرمسلم لڑکوں کے ساتھ مسلم لڑکیوں کی شادی، مسلمانوں کے زیرانتظام اسکولوں میں ہندوشعائر کی پذیرائی، یہاں تک کہ لباس وپوشاک اوراس سے آگے بڑھ کر مکانات کے کلرمیں زعفرانی رنگ کا استعمال، یہ ساری چیزیں وہ ہیں جومسلمانوں کواکثریت کی فکراورتہذیب کی طرف لے جارہی ہیں ، اب تو بہت سی جگہ مسلمان ہندوتہواروں میں جلوسوں کا استقبال بھی کررہے ہیں، مورتیوں اور پجاریوں کو ہار پہنا رہے ہیں، برقعہ پوش خواتین گنیش کے منڈپ میں جا کر بیٹھ رہی ہیں اور مندروں میں جا کر نذرانے پیش کررہی ہیں، یہاں تک کہ گزشتہ دنوں برادرانِ وطن کے ایک تہوار میں مولوی صورت اور مولوی لباس نام نہاد مسلمانوں کا ہاتھ باندھ کر مورتی کے سامنے کھڑا ہونا اور مشرکانہ کلمات ادا کرنا سوشل میڈیا کے ذریعہ تمام لوگوں تک پہنچ چکا ہے،جس پر خون کے آنسورویا جائے تب بھی کم ہے، یہ کچھ معمولی واقعات نہیں ہیں، یہ دو چار مسلمانوں کی شہادت سے کہیں بڑھ کر ہیں، یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، جب کوئی قوم اپنے مذہب اور تہذیب کے بارے میں احساس کمتری میں مبتلا ہوجاتی ہے تو پھر آہستہ آہستہ اس کا اپنی پہچان سے محروم ہوجانا دشوار نہیں ہوتا، پہلے تہذیبی انضمام کی نوبت آتی ہے، پھر مذہبی ارتداد کا طوفان آتا ہے؛ اس لئے ہمیں اس پہلو پر بہت گہرائی کے ساتھ غور کرنے اوراس فتنہ کا سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔

حضرات! اس سلسلے میں چند باتیں جو بہت اہم نظر آتی ہیں، اور جن کو انجام دینے میں علماء بنیادی رول ادا کر سکتے ہیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے:

۱- کوشش ہونی چاہئے کہ کوئی مسلمان لڑکا یا لڑکی بنیادی دینی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے، اس کے لئے زیادہ سے زیادہ مکاتب قائم کئے جائیں، چاہے یہ صباحی یا مسائی مکاتب ہوں، یا مغربی ملکوں کی طرح اتوار کو ہفتہ وار مکتب کا نظم ہو، اسی طرح عصری تعلیم کے کسی پرکشش مضمون، جیسے انگریزی، حساب یا سائنس کے ساتھ لازمی طور پر بنیادی دینی تعلیم کو شامل کرتے ہوئے کوچنگ سینٹر قائم کئے جائیں، ہمارے یہاں مکتب کے روایتی نظام میں کچھ ماثور اذکار اور چند پاروں کا ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا؛ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس تعلیم میں ایمانیات کو شامل کیا جائے، خاص کر توحید، شرک والحاد، انسانی زندگی کے لئے نبوت کی ضرورت، ختم نبوت کا عقیدہ اور جزاوسزا کا اسلامی تصور، اور اس کے مقابلہ تناسخ (جو تمام ہندوستانی مذاہب کا تقریباً مسلمہ عقیدہ ہے) کا غلط ہونا اور اس کا انسانی زندگی میں صالح انقلاب پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہونا واضح ہو جائے۔

۲- زیادہ سے زیادہ اسلامی اسکولوں کا قیام، جس میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے اسلامیات کی تعلیم لازمی ہو، اُن کے یونیفارم پُرکشش ہوں، مگر شریعت کے دائرہ میں ہوں، مڈل کلاس کے بعد لڑکوں اور لڑکیوں کی جداگانہ تعلیم کا نظام ہو، خواہ اسکول ہی الگ ہو جو سب سے بہتر طریقہ ہے، یا کم از کم کلاس روم الگ ہو، اور آخری درجہ یہ ہے کہ کلاس روم میں لڑکوں اور لڑکیوں کی صفوں کے درمیان ایک چھوٹی دیوار ہو اور آمد ورفت کے راستے الگ ہوں، اکیڈمی اپنے ۲۷ رویں سیمینار منعقدہ ممبئ میں اس سلسلہ میں تفصیلی تجویز منظور کر چکی ہے۔

۳- تعلیم اور ملازمت کے لئے جس امتحان اور ٹیسٹ (Test) کی ضرورت ہو، اس کے لئے کوچنگ کا انتظام کیا جانا چاہئے، اگر دینی مدارس بشرط گنجائش اپنے کیمپس میں نہ نفع نہ نقصان کی اساس پر فیس لے کر ایسے کوچنگ سینٹر قائم کریں گے تو نہ صرف اعلیٰ تعلیم میں مسلمان لڑکے آسکیں گے اور نہ صرف ان کو ملازمت کے بہتر مواقع مل سکیں گے؛ بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسلامی ماحول کی وجہ سے ان کے اندر دین کی عظمت اور اپنی شناخت کی حفاظت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور سرکاری تعلیمی اداروں میں جن مشرکانہ افکار واعمال پر ان کو مجبور کیا جاتا ہے، یا ان سے مانوس کیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اس سے محفوظ رکھ سکیں گے۔

۴- موجودہ دور میں اسکل ڈیولپمنٹ (Skill Development) اور فنی تعلیم کی بہت اہمیت ہے، جس کے ماہرین کی ضرورت ہر جگہ پڑتی ہے، ہندوستان میں ہنرمندوں کی تعداد ضرورت کے اعتبار سے بہت کم ہے، اور بیرون ملک میں اس کی بہت طلب ہے، اس کے ذریعہ صفر سرمایہ سے انسان اپنے کاروبار کو شروع کرسکتا ہے، اور کم تعلیم یافتہ نوجوان بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو پرائیویٹ ادارے ہیں، وہ اس کام کو کمرشیل بنیاد پر کرتے ہیں اور اس میں دینی تربیت کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا، اگر مذہبی تنظیمیں اور مدارس ایسے ادارے اور تربیتی مراکز قائم کریں، جن میں نسبتاً کم اخراجات ہوتے ہیں، تو اس سے مسلمانوں کو روزگار فراہم کرنے میں بڑی مدد ملے گی، اور وہ معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہوسکیں گے، اور جب معاشی اعتبار سے خود مکتفی ہوں گے تو ارتداد کی رو میں بہنے سے بچ سکیں گے۔

۵- انسان جن باتوں کو بار بار سنتا ہے، وہ اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ذرائع ابلاغ اسی اصول پر کسی نقطۂ نظر کے موافق یا مخالف فضا بناتے ہیں؛ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے میں حاصل اور میسر ذرائع ابلاغ کا استعمال فرمایا، آپ کعبۃ اللہ کے صحن سے بھی اہل مکہ کے سامنے توحید کی دعوت پیش کرسکتے تھے، لیکن آپ نے صفا کی پہاڑی پر چڑھ کر اپنی دعوت پیش کی؛ کیونکہ اُس وقت تمام اہل مکہ تک اپنی دعوت پہنچانے کا یہی سب سے مؤثر ذریعہ تھا، پھر آپؐ نے پورے جزیرۃ العرب تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے حج کے مبارک اجتماع اور بعض تجارتی میلوں کا سہارا لیا؛ حالانکہ اس وقت یہ اجتماعات بعض منکرات سے خالی نہیں ہوتے تھے؛ کیونکہ ان ہی اجتماعات کے ذریعہ ایک دوسرے سے پورے جزیرۃ العرب میں بات پہنچ جاتی تھی، پھر جب صلح حدیبیہ ہوگئی، مسلمانوں کو کچھ لمحات سکون کے میسر آئے، نیز اس کے بعد جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جزیرۃ العرب سے باہر جہاں تک سفارت کاری کے ذریعہ اسلام کی دعوت پہنچائی جاسکتی تھی، اس کی بھرپور کوشش کی، یہاں تک کہ بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق چین تک آپ کے نمائندے پہنچے، اس سے میڈیا کی اہمیت اور اسلام کی نظر میں اس کی وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں اور موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کو میڈیا جس درجہ نقصان پہنچا رہا ہے، شاید ہی کوئی اور طاقت اتنا نقصان پہنچا رہی ہو، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس میدان میں ہم اتنے پیچھے ہوچکے ہیں کہ ہمارے لئے اپنے بدخواہوں کی برابری میں آنا ناممکن سا نظر آتا ہے؛ لیکن بحیثیت مسلمان ہمارا فرض ہے کہ ہم جتنا کرسکتے ہیں، ضرور کریں۔

اس وقت سوشل میڈیا (Social Media) کا ایک ایسا دروازہ کھلا ہے، جو ایک سمندر کی طرح ہے، جس میں گندگیاں بھی ہیں اور صاف وشفاف پانی بھی، اور ہر شخص اس میں اتر کر طبع آزمائی کر سکتا ہے، آج کل سوشل میڈیا کے مختلف وسائل کے ذریعہ مؤثر انداز میں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بات پہنچائی جا سکتی ہے، اپنے یوٹیوب چینلس (Channels) قائم کئے جا سکتے ہیں، ٹی وی ڈیبیٹ میں جوز ہر پھیلایا جاتا ہے، یوٹیوب اور ویڈیوز کے ذریعہ اس کا جواب دیا جا سکتا ہے، اس پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے، ادھر ماشاء اللہ نوجوان علماء نے بھی بہت سے یوٹیوب چینل قائم کئے ہیں؛ لیکن زیادہ تر وہ روایتی پروگرام پیش کرتے ہیں، اور بعض دفعہ تو مسلکی لڑائی کے لئے اس کا استعمال کیا جاتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام مخالف چینلوں کے سوالات سامنے رکھ کر کم از کم یوٹیوب چینلوں کے ذریعہ ان کا جواب دیا جائے، جو لوگ سوشل میڈیا میں سرگرم ہیں، وہ باہمی ارتباط کے ذریعہ ایسے پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ پھیلائیں، اور جو مسلمان نوجوان آئی ٹی کی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں، ان کی تربیت کی جائے کہ جو پروگرام اسلام کی مخالفت میں آئے، وہ بڑے پیمانے پر اس پر تردیدی کامنٹ (Comment) دیں، اور جہاں اس سوال کا صحیح جواب مل سکتا ہو، اس کا حوالہ دیں، مقرر کے جھوٹ کو واضح کرتے ہوئے اس سے دلیل طلب کریں، اس طرح ہم مسلمانوں کی نئی نسل کو ارتدادی فکر سے بچا سکتے ہیں، اور بہت سے برادران انسانیت کی غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکتا ہے، فی الحال اس طرح ہم ایک حد تک میڈیائی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور اگر مسلمان اس میں دلت چینلوں سے رابطہ کر لیں اور ان سے بھی استفادہ کی راہ نکال لیں تو یہ کوشش اور زیادہ مؤثر ہو جائے گی۔

۶- مسلمانوں کے اندر فرقہ بندی اور اختلاف کا افسانہ ہمارے دشمن بھی مزے لے لے کر سناتے ہیں، اور ہم بھی نمک مرچ لگا لگا کر اس کو آگے بڑھاتے ہیں: بلکہ اپنے اختلافات کو میڈیا میں قوت اور مبالغہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں، کم از کم جن ملکوں میں ہم اقلیت میں ہیں، وہاں ہمیں ایسے رویے سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اپنے اختلافات کو درسگاہوں تک اور جب عوام سوال کریں تو فتاویٰ تک محدود رکھنا چاہئے، اور اس میں بھی اعتدال کا لحاظ ہونا چاہئے: کیونکہ اس وقت فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کے آپسی اختلاف کو بڑھاوا دینے کی پوری کوشش میں لگی ہوئی ہیں، ایسے موقع پر اِعراض کا راستہ اختیار کرنا بہتر ہوتا ہے، ہمیں دوسری قوموں سے سبق حاصل کرنا چاہئے، برادران وطن کے فرقوں کی تعداد بے شمار ہے، اور فکر وعمل کے اعتبار سے ان کے درمیان اتنی دوریاں ہیں، جیسے دریا کے دو کنارے؛ لیکن مسلمانوں کی مخالفت کی بنیاد پر اور مسلمانوں کا خوف

دلا کر قوم کو متحد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، عیسائیوں کے عام طور پر تین فرقے مشہور ہیں؛ لیکن شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ حقیقت میں ان کے تین سو سے زیادہ فرقے ہیں، جن کے درمیان شدید اعتقادی وفکری اختلاف ہے؛ مگر وہ اپنے اختلافات کو عوام میں لانے سے بچتے ہیں۔

حضرات! حاصل یہ ہے کہ اس وقت بہت چوکسی اور جہد مسلسل کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو برادران وطن کی مذہبی تقریبات میں شرکت سے روکنے کی، ایسے تہذیبی تشبہ سے منع کرنے کی جس سے کسی گروہ کی شناخت متعلق ہو، شعائر کفر سے بچانے کی، اسلامی شناخت پر ثابت قدم رکھنے کی، توحید وشرک کی سرحدوں کو اچھی طرح سمجھانے کی، شرک کی مختلف قسموں اور بالخصوص مشرکانہ اعمال کو واضح کرنے اور اپنی پہچان کی حفاظت کرتے ہوئے برادران وطن کے ساتھ تعلقات کو استوار کرنے کی ضرورت ہے، اور اگر ایسا نہیں کیا گیا **تو اندیشہ ہے کہ نئی نسل کا ایک بڑا حصہ پہلے تہذیبی ارتداد پھر اسلام کے روایتی اعمال پر قائم رہتے ہوئے فکری ارتداد اور آخر میں خدانخواستہ معلنہ ارتداد تک پہنچ جائے**، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

حضرات! اکیڈمی کے قیام کو ۳۵ رسال کا عرصہ گزر چکا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ اس عرصہ میں اس نے موجودہ سیمینار کو شامل کرتے ہوئے کُل ۳۲ رسالانہ فقہی سیمینار منعقد کئے ہیں، اس نے سن ۲۰۰۶ء میں چھوٹے بڑے فکری پروگراموں کا سلسلہ بھی شروع کیا اور اب تک ۶۳ رسیمینار منعقد ہو چکے ہیں، اکیڈمی کے مقاصد میں دینی مدارس اور عصری تعلیم گاہوں کے نوجوان فضلاء کی علمی تربیت بھی ہے، اس نقطۂ نظر سے اکیڈمی نے اب تک ۸۹ ر پروگرام کئے ہیں، اسی طرح دینی مدارس کے طلبہ کے لئے عصری موضوعات پر اور عصری درسگاہوں کے طلبہ کے لئے دینی موضوعات پر محاضرات اور پچھلے چند سالوں سے گرمائی کلاس کا سلسلہ بھی رکھا ہے، اکیڈمی کی مطبوعہ کتابیں بہ شمول فقہی مجلّات کے تقریباً ۴۰۰ ہوگئی ہیں؛ چونکہ آج کل کتابوں کے پڑھنے کا رواج کم ہو گیا ہے؛ اس لئے اکیڈمی کا تقریباً پورا لٹریچر اس کی ویب سائٹ پر ڈال دیا گیا ہے، اور اس میں بلا معاوضہ ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی رکھی گئی ہے؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ علم کی اشاعت ہو سکے۔

بہر حال یہ جو کچھ ہے ہم سبھوں کی مشترکہ کوششوں کا اثر ہے، اہم بات یہ ہے کہ اکیڈمی نے نئے مسائل پر سوچنے، لکھنے اور تبادلۂ خیال کرنے کے عمل کو ایک تحریک بنا دیا ہے، کسی ادارہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے لئے اُسوہ، نمونہ اور ماڈل بن جائے، اور اس سے روشنی حاصل کر کے نئے اداروں کو وجود میں لایا جائے، یا جو ادارے پہلے سے قائم تھے، اُن میں اس کے طریقۂ کار کو اختیار کیا جائے، الحمد للہ اسلامک

فقہ اکیڈمی کے منہج کو سامنے رکھتے ہوئے افغانستان، مغربی اور مشرقی پڑوسی ملک اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں مسائل فقہیہ پر اجتماعی غور وفکر کی مجلسیں قائم کی گئی ہیں، اور خود ہمارے ملک میں اس مقصد کے لئے جو قدیم ادارے قائم تھے، انھوں نے اپنے منہج میں اکیڈمی کے طریقۂ کار سے استفادہ کرتے ہوئے اس کو فعال بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ ان تمام خدمات کو قبول فرمائے اور اکیڈمی کے علمی وفکری سفر کو پوری قوت کے ساتھ جاری وساری رکھے۔

اس موقع پر اس سیمینار کے عالی حوصلہ اور مخلص میز بان، نیز علاقہ کے علم دوست احباب کا بھی بے حد شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس سیمینار کی میز بانی قبول فرمائی؛ بلکہ اس کی دعوت پیش کی، اور اس وقت آپ کے سامنے آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس خطہ پر اپنی رحمتیں نازل کرے اور اُن کی تمام دینی و دعوتی کوششوں کو قبول فرمائے۔(آمین) والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سرمایہ کاری کے بعض نئے طریقے اور ان کے احکام

مولانا شاہد علی قاسمی ❖

دور حاضر میں سرمایہ کاری کی نوعیت، مقدار اور طریقۂ کار میں بہت اضافہ ہوا ہے اور اسی حساب سے اس کی پیچیدگیاں بھی بڑھی ہیں، بڑے کارخانے، فیکٹریاں، بڑے مالی ادارے بغیر سرمایہ کاری کے ممکن نہیں، سرمایہ کاری کے جو اسلامی اصول ہیں، اور موجودہ دور میں سرمایہ کاری جن قوانین کے تحت ہوتی ہیں، اس میں بسا اوقات تضاد اور تخالف کی نوبت آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کے تعلق سے عالم اسلام کے علماء کرام اور فقہی اکیڈمیاں مسلسل اس سمت میں کوشاں رہی ہیں کہ سرمایہ کاری کے جدید مسائل شریعت کی روشنی میں حل کیے جائیں اور اسی کے ساتھ سرمایہ کاری میں جہاں شرعی قوانین اور ملکی قوانین میں تضاد ہے، وہاں شریعت کی مخالفت سے بچنے کا کوئی راستہ نکالا جائے، ذیل میں اس کی چند صورتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

عقدِ مضاربت کی ایک خاص صورت

فقہاء کی تصریحات کے مطابق مضاربت کے کاروبار میں حقیقی نفع کی تقسیم اسی وقت ممکن ہے جب کہ مضاربت اپنی انتہاء کو پہنچ جائے اور انتہاء کو پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ تمام اثاثہ جات کو راس المال کی جنس میں تبدیل کرلیا جائے، تبھی رب المال کو اس کا راس المال اور رب المال و مضارب کو حقیقی طور پر نفع تقسیم کر کے دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کا مسلک پیش کرتے ہوئے عبدالرحمن جزیریؒ فرماتے ہیں:

الحنفية قالوا: لا تصح قسمة الربح قبل أن يقبض صاحب المال رأس ماله، فإذا قسم الربح قبل ذالك

❖ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

وقعت القسمة موقوفة، فإن قبض المالك رأس المال صحت وإلا بطلت القسمة، و إذا قسم الربح و بقي رأس المال في يد المضارب ففسخ عقد المضاربة ثم جدد عقد مضاربة آخر، فإن الربح الذي قسم تنفذ قسمته و لا يرد بعد ذالك.(۱)

اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

وإن كانا يقتسمان الربح و المضاربة بحالها، ثم هلك المال بعضه أو كله ترادا الربح حتى يستوفي رب المال رأس المال، لأن قسمة الربح لا تصح قبل استيفاء رأس المال، لأنه هو الأصل و هذا بناء عليه و تبع له.(۲)

مضاربت کے ختم پر راس المال کی رب المال کی طرف حوالگی اور فریقین کے درمیان نفع کی تقسیم چھوٹے کاروبار میں آسان ہے، لیکن اس وقت بڑی بڑی کمپنیاں مضاربت اور شرکت یا مضاربت وشرکت کے اصولوں پر چل رہی ہیں، جو بڑی مدت تک چلتی ہیں، جن میں سرمایہ کی بڑی مقدار اور رب المال کی بڑی تعداد ہوتی ہے، کچھ رب المال سرمایہ اور نفع لے کر نکل جاتے ہیں، اور کچھ نئے افراد داخل ہوتے ہیں، بسا اوقات بعض رب المال کا انتقال ہوجاتا ہے، اس صورت حال میں کمپنی کے اثاثہ جات کو فروخت کرکے اور کمپنی کو بند کرکے راس المال کی حوالگی اور نفع کی تقسیم تقریبا ایک ناممکن عمل ہے، اسی لئے اس پہلو پر اہل علم نے غور کیا، اور بعض اہم عرب علماء نے تنضیض حکمی کی شکل بھی پیش کی، اور کہا کہ جو رب المال نکلنا چاہے، اس کے لئے نفع کی تقسیم کی یہی شکل ہوگی کہ کمپنی کے اثاثہ جات کی بازاری قیمت لگائی جائے، اور جو نقود ہیں ان سب کو ملا کر راس المال اور نفع کا حساب لگایا جائے، اگر کمپنی میں دس افراد کا سرمایہ ہے، جن کا مجموعہ مثلا ایک کروڑ ہے، اور جب کوئی رب المال نکلنے لگا تو کمپنی کے اثاثہ جات اور نقود کی مالیت ڈیڑھ کروڑ سامنے آئی تو اس کا مطلب ہے کہ پچاس لاکھ کا فائدہ ظاہر ہوا، لہٰذا نکلنے والے رب المال کو اس کا سرمایہ دے دیا جائے اور پچاس لاکھ نفع میں طے شدہ شرح سے اسے نفع بھی دے دیا جائے، یہی تنضیض حکمی ہے، اور اس پر عمل کی گنجائش ہے، کیونکہ اس کے سوا

---

(۱) الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۶۱/۳، مبحث فی قسمۃ الربح

(۲) ہدایہ: ۲۶۵/۳، کتاب المضاربۃ، فصل فی العزل والقسمۃ

دوسرا راستہ نہیں ہے، جیسا کہ ڈاکٹر عبدالستار ابوغدہ رقم طراز ہیں:

وبما أن المشاركات في المصارف و المؤسسات المالية الاسلامية أصبحت مرتبطة بدورات زمنية محددة مستمرة نظرا للطابع الجماعي في المستثمرين و المخارجة بينهم، فقد تعين بديل للتنضيض الفعلي في هذه الحالات و هو التنضيض التقديري (التقويم) حيث أن الرجوع للقيمة يعتبر مبدأ شرعيا في كثير من التطبيقات الفقهية كما في الغصب و تعذر الالتزام بالمثل فيصار للقيمة و كذالك في جزاء محظورات الحج و الصيد و غيرها.(۱)

اسی طرح کی رائے ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحیم العبادی نے اپنی کتاب: ''**موقف الشريعة من المصارف الإسلامية المعاصرة**'' میں پیش کی ہے، نیز مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے چوتھے اجلاس میں متفقہ طور پر تنضیض حکمی کے جواز پر قرارداد منظور کی گئی ہے:

أن محل القسمة هو الربح بمعناه الشرعي، و هو الزائد عن رأس المال و ليس الإيراد و الغلة و يعرف مقدار الربح إما بالتنضيض أو بالتقويم فهو الربح الذي يوزع بين حملة الصكوك و عامل المضاربة وفقاً لشروط العقد.

خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ صورتحال میں تنضیض حکمی کو معتبر مانتے ہوئے کسی رب المال کا راس المال اور نفع لے کر کمپنی سے باہر نکل جانا اور نئے افراد کا داخل ہونا درست ہے۔

جب رب المال متعدد ہوں اور کاروبار کی شکل مضاربت کی ہو تو اس بارے میں حکم یہ ہے کہ موجودہ دور میں کمپنی کی حیثیت شخص قانونی ہوتی ہے، گو کہ یہ اصطلاح جدید ہے، عہد رسالت، عہد صحابہ، ائمہ متبوعین اور متاخرین فقہاء کے دور میں شخص قانونی کی اصطلاح نہیں ملتی ہے، جب سے بڑی بڑی کمپنیوں کا وجود ہونے لگا اور ان کی حیثیتوں پر غور وخوض کیا جانے لگا تو اہل علم نے ایک نئی اصطلاح شخص قانونی یا فرد اعتباری کی وضع کی

---

(۱) الأجوبة الشرعية في التطبيقات المصرفية، دلة البركة: ۹۶/۲

اور پھراس پر احکام شرعیہ کو منطبق کیا، غور وخوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے لئے قانون شخصی کا اطلاق گو نئ اصطلاح ہے، لیکن اس کے نظائر عہد رسالت اور بعد کے ادوار میں موجود رہے ہیں، جیسے وقف، کہ وقف کی مستقل حیثیت ہے، یہ ایسا ادارہ ہے جو کبھی بائع بنتا ہے، کبھی مشتری بنتا ہے، کبھی صدقہ دیتا ہے اور کبھی دوسرے تصرفات کرتا ہے؛ حالانکہ وہ انسان نہیں ہے؛ بلکہ نئ اصطلاح میں اسے فرد اعتباری ہی کہا جاسکتا ہے، دوسری نظیر بیت المال کا نظام ہے کہ یہ بھی متعدد تصرفات کرتا ہے، گو کہ تصرف کرنے والے انسان ہوتے ہیں؛ لیکن انسان بہ حیثیت ملازم، یا بہ حیثیت وکیل یا بہ حیثیت ولی امر تصرف کرتا ہے، لیکن مالکانہ حقوق بیت المال کو حاصل ہوتے ہیں، گویا جدید اصطلاح میں یہ شخص قانونی اور فرد اعتباری ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی نظائر ہیں جیسے ترکہ مستغرقہ بالدین، کہ اس میں مدیون کی حیثیت ترکہ کو حاصل ہوجاتی ہے، نہ کہ میت یا اس کے وارثین کو، جب کہ ترکہ کوئی انسان نہیں ہے، پھر بھی وہ مدیون بن جاتا ہے، جب یہ بات واضح ہوگئ کہ کمپنی کی حیثیت شخص قانونی کی ہے، تو اسے تصرف کرنے والا بھی مانا جائے گا، اب یہ بات اہم ہے کہ پبلک کمپنی کی حیثیت مضارب کی ہوگی یا شرکت عنان کرنے والے کی یا کچھ اور؟ اس سلسلہ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر ہے کہ اس کی حیثیت شرکت عنان کی ہے، کیونکہ کمپنی قائم کرنے والے حضرات دوسرے شرکاء کی مانند کمپنی میں حصہ دار ہوتے ہیں [۱]، جب کہ بعض اہل علم کمپنی کو مضارب مانتے ہیں، کیونکہ کچھ حضرات کمپنی میں کام کرتے ہیں، اور کچھ لوگوں کا سرمایہ ہوتا ہے، اور یہی مضاربت کی حقیقت ہے، بہ ظاہر یہ بات بھی قابل قبول معلوم ہوتی ہے، کیونکہ مضاربت اور شرکت کے بہت سے احکام مشترک ہیں، جس طرح شرکت میں شرکاء مالکانہ حقوق رکھتے ہیں، اسی طرح مضاربت میں رب المال مالکانہ حقوق رکھتے ہیں، لہٰذا شرکت عنان ماننے میں جہاں کمپنی میں شرکاء کی ملکیت مانی جاتی ہے، اسی طرح مضاربت ماننے میں رب المال کی حیثیت کمپنی میں مالکانہ حقوق رکھنے والے کی ہوگی۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں نفع کی تقسیم اسے ملحوظ رکھتے ہوئے کی جائے گی، یعنی کمپنی کے تمام نقود و اثاثہ جات کی مالیت کا حساب کیا جائے گا، پھر تمام لوگوں کے سرمایہ کا مجموعہ دیکھا جائے گا، کمپنی کی جو مالیت ما بہ الفضل ہو، یعنی مجموعی سرمایہ سے جو زائد ہو وہ نفع سمجھا جائے گا، جسے حسب معاہدہ تمام سرمایہ کار کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ کمپنی کو مضارب کی حیثیت دینے کی گنجائش ہے۔ اور جس طرح کمپنی کے شرکاء متعدد ہوسکتے ہیں، اسی طرح رب المال بھی متعدد ہوسکتے ہیں۔

---

(۱) امداد الفتاوی: ۳/ ۴۹۴

شرکت متناقصہ کا حکم

سرمایہ کاری کے جدید ذرائع میں سے ایک شکل وہ ہے جو جسے شرکت متناقصہ کہا جا سکتا ہے، وہ اس وقت مروج ہے، بعض اسلامی بینک والے اس طرح کے معاملات کرتے ہیں، جہاں تک حکم شرعی کی بات ہے تو یہ بات شرعا درست ہے کہ دو فریق مل کر کوئی چیز خریدیں، جیسے دو آدمی مل کر کار خریدیں، اور دونوں اس سے کرایہ کی شکل میں فائدہ اٹھائیں، اور یہ بات بھی درست ہے کہ ایک فریق اپنا حصہ دوسرے فریق کو کرایہ پر دے دے، یہ بہ اتفاق جائز ہے، اسی طرح زیر بحث صورت میں بینک اپنا حصہ دوسرے شریک کو کرایہ پر دے دے، خواہ بینک اپنا حصہ تقسیم کئے بغیر کرایہ پر دے، البتہ فقہاء کا اختلاف اس وقت ہے جب کہ ایک شریک اپنا حصہ کسی اجنبی یعنی غیر شریک کو کرایہ پر دے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز نہیں ہے، اسی طرح تین یا اس سے زیادہ شرکاء ہوں، اور ایک شریک اپنا حصہ کسی ایک شریک کو کرایہ پر دے تو یہ بھی امام صاحب کے نزدیک جائز نہیں ہے، علامہ حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(و) تَفْسُدُ أيْضًا (بِالشُّيُوعِ) بِأنْ يُؤَجِّرَ نَصِيبًا مِن دارِهِ أوْ نَصِيبَهُ مِن دارٍ مُشْتَرَكَةٍ مِن غَيْرِ شَرِيكِهِ أوْ مِن أحَدِ شَرِيكَيْهِ أنْفَعُ الوَسائِلِ وعِمادِيَّةٌ مِن الفَصْلِ الثَّلاثِينَ. واحْتَرَزَ بِالأصْلِيِّ عَنْ الطّارِئِ فَلا يُفْسِدُ عَلى الظّاهِرِ، كَأنْ آجَرَ الكُلَّ ثُمَّ فَسَخَ فِي البَعْضِ أوْ آجَرا لِواحِدٍ فَماتَ أحَدُهُما أوْ بِالعَكْسِ وهُوَ الحِيلَةُ فِي إجارَةِ المُشاعِ، كَما لَوْ قَضى بِجَوازِهِ (إلّا إذا آجَرَ) كُلَّ نَصِيبَهُ أوْ بَعْضَهُ (مِن شَرِيكِهِ)فَيَجُوزُ، وجَوازُهُ بِكُلِّ حالٍ، وعَلَيْهِ الفَتْوى زَيْلَعِيٌّ وبَحْرٌ مَعْزِيًّا لِلْمُغْنِي.(۱)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جن دو صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے وہ صورتیں امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک درست ہیں۔ جیسا کہ یہ حضرات **هبة المشاع** کو جائز قرار دیتے ہیں، اسی طرح **إجارة المشاع** کو بھی جائز قرار دیتے ہیں، صاحب ہدایہ فرماتے ہیں:

---

(۱) الدر المختار مع الرد: ۶ / ۴۷

قال: ولا يجوز إجارة المشاع عند أبي حنيفة إلا من الشريك، وقالا: إجارة المشاع جائزة، وصورته أن يؤاجر نصيبا من داره أو نصيبه من دار مشتركة من غير الشريك. لهما أن للمشاع منفعة ولهذا يجب أجر المثل، والتسليم ممكن بالتخلية أو بالتهايؤ فصار كما إذا آجر من شريكه أو من رجلين وصار كالبيع.(۱)

دریافت کردہ شکل میں جب بینک شریک دوم کو اپنا حصہ کرایہ پر لگائے تو یہ بہ اتفاق درست ہے، البتہ شریک دوم کا مکان کے تھوڑے تھوڑے حصے کو بینک سے خریدنا درست ہے یا نہیں؟ تو اگر یہ سب معاملات یعنی شرکت کے ساتھ خریداری، پھر اجارہ اور پھر آپسی بیع ایک دوسرے کے ساتھ مشروط نہ ہوں تو درست ہے، اور اگر آپس میں مشروط ہوں تو درست نہیں ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ایک معاملہ میں دوسرا معاملہ کرنے سے منع کیا گیا ہے:

عن عبد الله بن مسعود قال:نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن صفقتين في صفقة واحدة.(۲)

اب قابل غور یہ ہے کہ مکان کی خریداری میں شرکت متناقصہ کی شکل اختیار کرنا اور چند معاملات کرنا مشروط ہوتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا فیصلہ فریقین کے معاملات و معاہدات اور عملی شکل کو دیکھ کر لگایا جاسکتا ہے، اصولی جواب تو یہی ہوگا کہ یہ سب معاملات (شرکت، اجارہ، بیع) ایک دوسرے کے ساتھ مشروط ہوں تو درست نہیں ہے، اور مشروط نہ ہوں تو درست ہے۔

کمپنی کو شخصیت اعتباری کا درجہ دے کر ایجاب یا قبول کا اہل ماننے کا حکم

فی زمانہ کمپنیوں اور اداروں کو شخص اعتباری اور شخص قانونی کا درجہ حاصل ہے، جس کے نظائر قرون اولی میں ملتے ہیں، لہذا ایک کمپنی کا پروجیکٹ ہو، اور وہ کمپنی اپنے پروجیکٹ کی تکمیل کے لئے افراد واشخاص سے معاملت کرے یا دوسری کمپنی سے کام کروائے، دونوں شکلیں درست ہیں، جہاں تک ایجاب وقبول کی اہلیت کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ ایجاب وقبول کا معاملہ کوئی انسان ہی کرے گا، لیکن وہ کمپنی کا نمائندہ اور وکیل بن کر ایجاب یا قبول کرے گا، شرعا اس میں قباحت نہیں ہے۔

---

(۱) ہدایہ: ۳/ ۲۳۸، نیز دیکھئے المغنی: ۵/ ۵۵۳ (۲) مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۶۳۸۲

بینک کا کسٹمر کو سامان مرابحۃً بیچنا کیا بیع قبل القبض ہے؟

''مرابحة للآمر بالشراء'' کی تھوڑی وضاحت کچھ یوں ہے:

(۱) سب سے پہلے کسٹمر بینک سے ایک معاہدہ کرتا ہے، اس معاہدہ میں کسٹمر بینک سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ مطلوبہ سامان بینک سے خریدے گا، اس وعدہ کو مزید پختہ کرنے کے لئے بینک کسٹمر سے ایک مخصوص رقم بطور سیکیورٹی جمع کرانے کا تقاضا کرتا ہے، تاکہ کسٹمر کے وعدہ سے مکر جانے کی صورت میں اگر بینک وہ سامان خرید چکا ہو تو اسے واپس کرنے یا کسی اور کو بیچنے کی صورت میں ہونے والے نقصان کو اس سیکیورٹی سے پورا کرے۔ بینک کسٹمر کو یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ مطلوبہ سامان خرید کر مقررہ مدت میں اسے بیچے گا ادائیگی کا طریقہ کار اور بینکاری کے دیگر معاملات کی تفصیلات طے کی جاتی ہیں۔

(۲) پھر بینک اسی کسٹمر سے ایک معاہدہ کرتا ہے جسے (Agency Agreement) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت بینک اسی کسٹمر کو اپنا وکیل مقرر کرتا ہے کہ وہ بینک کی وکالت یا نیابت میں جاکر مطلوبہ سامان خرید لے۔

(۳) بینک اس سامان کی قیمت ادا کرتا ہے جو کبھی تو کسٹمر کو وکیل بنا کر اور کبھی براہ راست جاکر یا اپنے کسی اور نمائندہ کو بھیج کر۔

(۴) سامان کسٹمر کو موصول ہوتا ہے اور جب تک وہ سامان کسٹمر تک نہ پہنچے اور کسٹمر اسے خرید نہ لے وہ بینک کی ملکیت ہوتا ہے اور سامان کی تلفی یا کسی نقصان کی صورت میں بینک اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(۵) پھر ایک الگ معاہدہ کے تحت کسٹمر بینک سے وہ سامان مرابحہ کے طور پر خرید لیتا ہے، اور اس کی ملکیت حاصل کرتا ہے۔

(۶) کسٹمر اس سامان کی قیمت اقساط میں بینک کو ادا کرتا ہے۔ اس ترتیب سے ''مرابحة للآمر بالشراء'' کا وجود ہوتا ہے۔ اس کا حکم شرعی یہ ہے کہ اگر بینک اپنا نمائندہ بھیج کر سامان خریدے پھر وہ نمائندہ کسٹمر کو سامان حوالہ کردے، تو شرعاً اس میں کوئی خرابی نہیں ہے؛ کیونکہ یہ صورت واضح طور پر بیع قبل القبض میں داخل نہیں ہے، لیکن اگر بینک کسٹمر ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجے اور رسید اپنے نام بنوا کر سامان زیر تصرف لے آئے تو کیا یہ بیع قبل القبض کی شکل ہے، جو ممنوع ہے، یا اسے بیع بعد القبض مانا جائے گا جو ممنوع نہیں ہے؟ قبضہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے پائے جانے اور نہ پائے جانے کی بات عرف وتعامل پر مبنی ہے، کیونکہ قبضہ کی حقیقت

منصوص نہیں ہے، زیر بحث مسئلہ میں یہ پہلوتو ماننا پڑے گا کہ جب کسٹمر نے بینک کے نمائندہ کی حیثیت سے سامان خریدا یعنی وکیل بالشراء بن کر، تو ظاہر ہے کہ بروقت وکیل کا اس پر قبضہ بینک کی طرف سے مانا جائے گا، گویا کسٹمر وکیل بالشراء اور وکیل بقبض المبیع بھی بنا، اس طرح بینک وکیل کے واسطے سے قابض ہوگیا، کیونکہ وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ مانا جاتا ہے، رہی یہ بات کہ کسٹمر اس سامان کو اپنے پاس رکھ کر ہی استعمال میں لائے گا، بینک کے پاس سامان نہیں جائے گا، تو کسٹمر کے قبضہ میں منتقلی کب مانی جائے گی؟ تو جواب یہ ہے کہ جب یہ سامان کسٹمر کے ضمان میں چلا جائے تب بینک کا قبضہ ختم ہوکر کسٹمر کے قبضہ میں منتقل ہونا سمجھا جائے گا، اب یہ پہلو اہم ہے کہ کسٹمر کے ضمان میں سامان کب منتقل ہورہا ہے؟ اگر رسید بنانے ہی کو ضمان کی منتقلی مانیں تو چونکہ رسید خریداری کے وقت ہی بنائی جاتی ہے، تو اس صورت میں بینک کا قبضہ متحقق ہونا پھر کسٹمر کی طرف قبضہ کا منتقل ہونا مشکوک نظر آتا ہے، اور یہ شبہ مزید قوی ہوجاتا ہے کہ اس مرحلہ تک مرابحہ کا وجود ہی نہیں ہوا ہے، بلکہ اب تک بینک کے لئے خریداری ہوئی ہے، ابھی بینک نے کسٹمر کو بیچا ہی نہیں ہے، تو نتیجتاً ماننا پڑے گا کہ عقد مرابحہ وجود میں آنے سے پہلے کسٹمر کے نام رسید بنادی گئی ہوتو یہ کسٹمر کے لئے قبضہ ضمان نہیں ہوگا، بلکہ قبضہ امان ہی ہوگا، ہاں، جب اگلا مرحلہ بیع مرابحہ کا وجود میں آئے گا، اس وقت بینک کسٹمر کو سامان استعمال کرنے کی زبانی یا تحریری اجازت دے دے تو اس وقت سے بینک کا قبضہ ختم ہوکر کسٹمر کا قبضہ مانا جائے گا، کیونکہ استعمال کی اجازت دینا اور اس اجازت کی وجہ سے کسٹمر کا اس سامان کو استعمال کرنا قبضہ ضمان کے راستہ ہی سے مانا جاسکتا ہے، ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی کہ کسٹمر کی خریداری سے لے کر عقد مرابحہ کے وجود تک سامان پر بینک کا قبضہ ہے، اور عقد مرابحہ کے وجود اور پھر سامان کے استعمال کی اجازت کے بعد کسٹمر کا قبضہ ہے، لہٰذا اس ترتیب کی رعایت سے بیع قبل القبض کا مفسدہ سامنے نہیں آئے گا تاہم بہتر یہ ہے کہ سامان کی خریداری کے لئے بینک اپنا کوئی نمائندہ بھیجے اور سامان کو اپنے قبضہ میں لے لے، پھر بینک کسٹمر سے عقد مرابحہ کرکے سامان حوالہ کردے تو اس میں شرعا کوئی محظور لازم نہیں آئے گا، اور بیع قبل القبض کا شبہ نہیں ہوگا۔

اگر کمپنی جزوی طور پر حرام کاروبار میں ملوث ہو، اس کا شیئر خریدنا کیسا ہے جب کہ صورت حال یہ ہے دنیا کے بیشتر ملکوں میں بڑی کمپنیاں کچھ نہ کچھ ناجائز کاموں میں ملوث ہوتی ہیں، اور ان کے شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے، تو کیا کسی مسلمان کے لئے ایسی کمپنیوں کا شیئر خریدنا درست ہوگا؟ اس سلسلہ میں محتاط حکم تو یہی ہے کہ ایسی کمپنیوں کا شیئر خریدا ہی نہ جائے کہ یہی تقوی کا تقاضا ہے، نیز شیئرز کی خرید وفروخت کے مختلف

طریقے مروج ہیں، جن میں بیشتر ناجائز طریقے ہیں، اس لئے اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار حلال بھی ہو، یعنی حلال چیزوں کا کاروبار کرتی ہو تب بھی معاملہ مشتبہ رہتا ہے، کیونکہ اس نے شیئرز کی خرید وفروخت کے بیشتر طریقے غیر شرعی اصولوں سے وضع کر رکھے ہیں۔ لہٰذا شیئرز کی خرید وفروخت میں داخل نہ ہونا ہی مبنی بر احتیاط ہے، تاہم نفع کمانے کے اتنے بڑے ذریعے سے مسلمانوں کو دور رکھنا اجتماعی خسارہ کی بات ہے، اس لئے ارباب افتاء نے کچھ شرطوں کے ساتھ شیئرز کی خریداری کی اجازت دی ہے، تاکہ مسلمان مال کمانے کے ایک اہم ذریعہ سے محروم نہ ہوجائیں، اس وقت مقصود ان تمام شرطوں کو ذکر کرنا اوران پر بحث پیش کرنا نہیں ہے، البتہ ان شرائط میں دو شرطیں زیر بحث ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ جس کمپنی کا شیئر خریدا جارہا ہو اس نے تینتیس فیصد سے زیادہ سرمایہ حرام کاروبار میں نہ لگایا ہو، یا تینتیس فیصد سے زیادہ سرمایہ بینک میں ڈپازٹ نہ کیا ہو، اس شرط کی کیا حیثیت ہے؟ اس شرط کے تعلق سے فقہاء کی کتابوں میں کوئی صریح جزئیہ راقم الحروف کو نہیں ملا، تاہم متعدد ارباب افتاء اس شرط کے معتبر ہونے کے قائل نظر آتے ہیں، ان میں ایک اہم نام حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا ہے(۱)، ارباب افتاء کی پیش کردہ یہ شرط راقم الحروف کی نگاہ میں بہت مناسب ہے، کیونکہ اس کی تائید ایک حدیث شریف کے اشارہ سے ہوتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ ثلث مال کی وصیت کرسکتے ہو لیکن ثلث بھی کثیر ہے:

عن عامر بن سعد عن أبيه قال عادني رسول الله صلى الله عليه وسلم في حجة الوداع من وجع أشفيت منه على الموت فقلت يا رسول الله بلغني ما ترى من الوجع وأنا ذو مال ولا يرثني إلا ابنة لي واحدة أفأتصدق بثلثي مالي قال لا قال قلت أفأتصدق بشطره قال لا، الثلث والثلث كثير.(۲)

اس حدیث شریف میں تہائی مال کو کثیر کہا گیا، لہٰذا کسی کمپنی کا تہائی سے زیادہ سرمایہ حرام کاروبار میں لگا ہوا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ کمپنی کا کثیر سرمایہ حرام کاروبار میں لگا ہوا ہے، اور جب کثیر سرمایہ حرام کاروبار میں لگا ہوا ہو تو للأكثر حكم الكل کے تحت اس کمپنی کا شیئر خریدنا درست نہیں ہوگا۔ نیز جب اتنا بڑا سرمایہ حرام

(۱) دیکھئے: اسلام اور جدید مالیاتی ادارے، ص: ۶۲

(۲) مسلم شریف، حدیث نمبر: ۱۶۲۸، کتاب الوصیۃ

کاروبار میں لگا ہوا ہوتو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمپنی کا مقصد حلال کاروبار کرنا نہیں ہے، اگر حلال کاروبار کرنا مقصود ہوتا تو اتنا بڑا اسرمایہ حرام کاروبار میں نہیں لگایا جاتا، اور جس کمپنی کا مقصد ہی حرام کاروبار کرنا ہو اس کا شیئر خریدنا درست نہیں ہے، جیسا کہ فقہ کا قاعدہ ہے: الأمور بمقاصدها (الأشباه والنظائر، القاعدة الثانية) جہاں تک دوسری شرط کی بات ہے کہ اس کمپنی کے نفع میں کل نفع کا پانچ فیصد یا اس سے کم حرام کاروبار سے آیا ہو، پانچ فیصد سے زیادہ نفع حرام طریقہ سے آیا ہو تو ایسی کمپنی کا شیئر خریدنا درست نہیں، تو کیا یہ شرط معتبر ہے؟ اس کے معتبر ہونے کی کیا دلیل ہے؟ راقم الحروف کو اس کی کوئی واضح دلیل نہیں ملی، غالبا یہ شرط اقتصادیات کے ماہرین کے تجربہ کی روشنی میں ہے، لیکن جب اس کی واضح دلیل نہ ہو تو اسے شرط کا درجہ دینا درست نہیں ہے، ہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اس شرط کی رعایت مستحسن ہے؛ کیونکہ اس کے پیچھے ماہرین اقتصادیات کے تجربات ہیں، جن کے عرف میں پانچ فیصد سے زیادہ نفع، کثیر نفع کے دائرہ میں آتا ہو، لیکن اسے بنیادی شرط کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، اگر شیئر ہولڈر کے نفع میں کچھ حصہ حرام والا ہو تو اس حصہ کو ذاتی استعمال میں لانا درست نہیں ہے، اس کو صدقہ کر دیا جائے گا، جیسا کہ عام اموال حرام کا حکم ہے۔

عبادات سے متعلق استحسانی مسائل

محمد حسن ندوی ❖

مقالہ نگار کو تخصص فی الفقہ سال دوم میں استحسانی مسائل کا عنوان دیا گیا تھا، اس کا کچھ حصہ یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

فقہاء کرام نے تقریباً فقہ اسلامی کے تینوں ابواب (عبادات، معاملات، اور مناکحات) میں استحسان کی بنیاد پر احکام شرعیہ کا استنباط فرمایا ہے، اسی لئے مناسب معلوم ہوا کہ اسی فقہی ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے استحسانی مسائل کو جمع کیا جائے اور پھر اسی ترتیب سے استحسان تطبیقات بیان کی جائیں اور عبادات کے باب میں فقہاء کی ترتیب یہ رہی ہے کہ پہلے ''طہارت'' سے متعلق مسائل کو بیان کیا جاتا ہے؛ لہٰذا یہاں بھی اسی نہج کو باقی رکھتے ہوئے پہلے ''کتاب الطہارت'' بیان کی جارہی ہے۔

طہارت سے متعلق چند استحسانی مسائل

یعنی طہارت کے وہ مسائل جو استحسان کی قبیل سے ہیں، ان کی تعداد بہت ہے، اسی طرح دیگر ابواب سے متعلق بھی استحسانی مسائل بہت موجود ہیں، مگر یہاں ان کا احاطہ یا ان تمام کا جمع کرنا مقصود نہیں ہے؛ بلکہ مطلوب یہ ہے کہ بعض اہم مسائل بطور نمونہ بیان کئے جائیں اور ان سے متعلق وجہ استحسان یا استحسانی تطبیق پیش کی جائے؛ کیوں کہ یہاں استحسانی مسائل بیان کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ کچھ اہم تطبیقات سامنے آجائیں؛ تاکہ ان تطبیقات کے ذریعہ دوسرے استحسانی مسائل سمجھنے میں آسانی ہو۔

❖ فاضل المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

معذورین کے وضوء کے بارے میں خصوصی رعایت

معذورین جیسے مستحاضہ، یا ایسا زخم والا جس کا زخم بہتا ہو، جس کو اسہال کی بیماری ہو، دائمی نکسیر ہو، یا وہ معذورین جن پر ایک نماز کا وقت پورا نہ گزرا ہو کہ اس سے پہلے وہ اس بیماری کی وجہ سے حدث میں مبتلا ہوجاتے ہوں، تو ایسے معذورین سے نجاست کا خارج ہونا اس وقت تک حدث شمار نہیں ہوگا، جب تک ایک نماز کا وقت باقی رہے گا، حتیٰ کہ اگر کوئی مستحاضہ وضوء کرے اور وہ نماز پڑھنا چاہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ جب تک وقت ختم نہ ہو فرائض ونوافل میں سے جتنی نماز پڑھنا چاہے پڑھے، اگر چہ سیلان دم کا تسلسل ہو، یہ صورت فقہاء احناف کے نزدیک ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: اگر عذر سبیلین میں ہو مثلاً: استحاضہ، سلسل بول، خروج ریح تو ایسا شخص ہر فرض کے لئے وضوء کرے گا، پھر اگر فرض کے ضمن میں نوافل پڑھنا چاہے، تو جتنا چاہے پڑھ سکتا ہے:

ہر فرض کے لئے وضوء کرے، اور نوافل میں سے جتنی چاہے پڑھے۔(۱)

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

يتوضأ لكل صلاة.(۲)

کہ وہ ہر نماز کے لئے وضوء کرے۔

استدلال میں اس روایت کو پیش کرتے ہیں:

أن النبي صلى الله عليه وسلم قال: إن المستحاضة تتوضأ لكل صلاة.(۳)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ مستحاضہ ہر نماز کے لئے وضوء کرے۔

معلوم یہ ہوا کہ ہمارے نزدیک مستحاضہ ہر نماز کے وقت کے لئے وضوء کرے گی، پھر اگلی نماز کے وقت تک جتنی نماز پڑھنا چاہے، پڑھ سکتی ہے، یہی حکم مذکورہ تمام معذورین کے لئے ہوگا، امام شافعیؒ کے نزدیک

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الطہارت: ۱/ ۲۸

(۲) حوالۂ سابق

(۳) صحیح ابن حبان، باب الحیض والاستحاضہ، حدیث نمبر: ۱۳۵۴

مستحاضہ ہر فرض کے لئے وضوء کرے گی ،فرض کے ضمن میں نوافل بھی پڑھ سکتی ہے، امام مالکؒ کے نزدیک ہر نماز کے لئے نیا وضوءضروری ہے۔

احناف کی دلیل وہی روایت ہے جس کو امام مالکؒ نے مستدل بنایا ہے،مگر احناف کہتے ہیں کہ روایت میں مذکورہ لفظ ''لکل'' کا ''لام'' وقت کے لئے ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''ہر نماز کے وقت کے لئے وضوء کرو'' چنانچہ مولانا ظفر احمد تھانوی لکھتے ہیں:

> ظاہر ہے کہ یہاں مکان مراد نہیں تو زمان خودبخود متعین ہے (یعنی ''لکل'' کا لام مکان (صلاۃ) کے لئے نہیں؛ بلکہ زمان (وقت) کے لئے ہے۔(۱)

اور زمان مراد پر نماز شرعی وقت ہے، جو کہ واضح ہے اور اسی پر لفظ ''توضئ'' یعنی تم وضوء کرو، محمول کیا جائے گا؛ چنانچہ واضح ہوا کہ اس میں ''لام'' وقت کے لئے ہے، نہ کہ صلاۃ (نماز) کے لئے امام طحاوی نے اس کو اور واضح فرمادیا؛ چنانچہ لکھتے ہیں :

> ہمارا نظریہ یہ ہے کہ عورت نماز کے وقت میں وضوء کرے، اور نماز پڑھے، پھر اگر وہ اس وضوء سے نفل پڑھنا چاہے تو جب تک اس نماز کا وقت باقی ہے، وہ نفل پڑھ سکتی ہے۔(۲)

احناف اس کی دلیل میں وہ روایت بھی پیش کرتے ہیں، جس کو امام ابوحنیفہ حمادؒ کی سند سے بیان کرتے ہیں:

> إذا طهرت المرأة في وقت صلاة، فلم تغتسل حتى يذهب الوقت بعد أن تكون مشغولة فى غسلها فليس عليها قضاء: قال محمد و به نأخذ.(۳)

> جب عورت کسی نماز کے وقت پاک ہوجائے ، اور وہ اس نماز کے وقت کے ختم ہوجانے تک غسل نہ کرے، اس کے بعد اگر وہ عورت غسل میں مشغول ہو اور نماز کا وقت گزر جائے ،تو اس پر اس نماز کی قضاء لازم نہیں ہوگی ،امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اسی قول پر عمل کرتے ہیں۔

---

(۱) اعلاء السنن، الحیض والنفاس الخ: ۱/ ۳۶۸ (۲) حوالۂ سابق

(۳) کتاب الآثار لمحمد، باب الحائض فی صلاتہا: ۱/ ۹۵

لہٰذا اس روایت میں پاکی کے لئے نماز سے نہیں؛ وقت سے بحث کی گئی ہے، جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ لفظ ''لکل'' کا لام نماز کے لئے نہیں؛ بلکہ وقت کے لئے ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حدیث میں اس وقت مراد ہے اور مستحاضہ ہر نماز کے وقت کے لئے وضوء کرے گی، پھر اس وضوء کے ذریعہ اگلی نماز کے وقت تک جتنی نماز پڑھنا چاہے، پڑھ سکتی ہے، تو اسی سے حکم شرعی نکل جاتا ہے ان تمام معذورین کا جو اسی طرح دائمی مرض میں مبتلاء ہوں تو ان سب کے لئے حکم شرعی یہی ہوگا کہ ہر نماز کے اول وقت میں وضوء کرکے اگلی نماز کا وقت شروع ہونے تک وہ فرائض، نوافل میں سے جو پڑھنا چاہیں پڑھ سکتے ہیں۔

چنانچہ عام قاعدہ تو یہ ہے کہ نجاست کی حالت میں نماز نہیں ہوسکتی، مگر استحاضہ والی حدیث کی بنیاد پر ان تمام معذورین کو جن کو دائمی مرض لاحق رہتا ہے، ایک نماز کے وقت سے دوسرے وقت تک ان کو نماز پڑھنے کی اجازت ہے، اگرچہ اس دوران سیلان دم کا تسلسل ہو، یا وہ بہتا ہو، تو گویا عام قاعدہ سے معذورین کی یہ اجازت حدیث کی بنیاد پر مستثنیٰ فرمائی گئی ہے؛ لہٰذا یہاں قیاس عام، یا قاعدہ عامہ کے قابل میں دلیل قوی کی بنیاد پر استثناء کیا گیا اور وہ دلیل قوی نص ہے، اس اعتبار سے کہا جائے گا کہ یہاں استحسان بالنص ہوا ہے۔

غسل میں عورتوں کا چوٹی کھولنا

غسل پاکیزگی کے لئے عورتوں کو چوٹی اگر گندھی ہوئی تو اس کا کھولنا ضروری نہیں، جب کہ پانی بالوں کی جڑوں میں پہنچ جائے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے:

یکفیك إذا بلغ الماء أصول الشعر.(۱)

کہ تمہارے لئے یہی کافی ہے (چوٹی نہ کھولنا) جب کہ بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے۔

اس مسئلہ میں قیاس تو یہ تقاضا کرتا ہے کہ چوٹی کھول کر غسل کیا جائے، ورنہ یہ احتمال اور شک باقی رہتا ہے کہ کوئی جگہ خشک تو نہیں رہ گئی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی جگہ خشک رہ جائے تو وہ غسل نہیں ہوتا ہے۔

لیکن استحسان یہ ہے کہ بار بار چوٹی کھولنے اور باندھنے میں عورت کو دشواری ہوتی ہے، جیسا کہ

---

(۱) ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب المرأۃ ہل تنقضی الخ: ۱/۶۶، حدیث نمبر: ۲۵۵۰

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں: "لما فيه من الحرج" [1] کہ اس صورت میں عورتوں کو دشواری ہوتی ہے، اسی لئے اس مشقت کو دُور کرتے ہوئے رعایت دی گئی کہ اگر چوٹی کی حالت میں بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچ جائے تو عورت کا غسل ہوجائے گا۔

لہٰذا یہاں قیاس کو چھوڑ کر حدیث کی بنیاد پر حکم لگایا گیا، اسی لئے اس کو بھی استحسان بالنص سے تعبیر کیا جائے گا۔

غسل جنابت میں دانتوں کی جڑوں تک پانی نہ پہنچنا

جنبی جب غسل کرے اور اس کے دانتوں کے درمیان کھانے کی، یا دوسری کوئی چیز اٹکی ہوئی ہو، جس کی وجہ سے نیچے تک پانی نہ پہنچ پا رہا ہو، تو بھی مسئلہ یہی ہے کہ اس کا غسل درست ہوجائے گا۔

مگر قیاس کی رو سے اگر دیکھا جائے تو دانتوں کے درمیان جو چیز موجود ہے اور اس چیز کے نیچے بدن کا جو حصہ ہے اس تک پانی نہ پہنچنے کی وجہ سے غسل نہیں ہونا چاہئے؛ کیوں کہ بدن کا وہ حصہ اگرچہ تھوڑا ہو؛ مگر اس تک پاک پانی نہیں پہنچ سکے گا، جس کی وجہ سے اسے خشک حصہ ہی شمار کیا جائے گا، اور یہ حدیث ہے کہ "اگر ایک بال بھی خشک رہ گیا تو غسل نہیں ہوگا؛ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تحت كل شعرة جنابة، فاغسلوا الشعر، و انقوا البشر. [2]

ہر بال کے نیچے جنابت ہے؛ لہٰذا تم ہر بال کو دھولو، اور کھال کو بھی صاف کرو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دانتوں کے درمیان جو حصہ خشک رہ جائے اس کی وجہ سے غسل نہیں ہوگا، مگر استحسان یہ ہے کہ اس کا غسل درست ہوجائے گا؛ چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے:

و إذا اغتسل من الجنابة وبقي بين أسنانه طعام فلم يصل الماء تحته جاز؛ لأن ما بين الأسنان رطب فلا يمنع وصول الماء إلى ماتحته. [3]

جب کوئی غسل جنابت کرے اور دانتوں کے درمیان کھانے کے اجزاء رہ جائیں اور وہ اس کے نیچے پانی نہ پہنچا سکے تو اس کا غسل ہوجائے؛ کیوں کہ دانتوں کے

---

(۱) ہدایہ، فی الغسل: ۱/ ۱۲۲

(۲) سنن ابی داؤد، باب فی الغسل جنابۃ: ۱/ ۶۵، حدیث نمبر: ۲۴۸

(۳) فتاویٰ التاتارخانیہ، کتاب الطہارۃ فی الغسل: ۱/ ۲۷۷

درمیان جو رطوبت ہے، اسی کے ساتھ پانی بھی دانتوں کی جڑوں تک پہنچ جاتا ہے۔

یہی وجہ کبیری میں نقل کی گئی ہے؛ چنانچہ لکھا ہے:

لأن الماء شيء لطيف يصل تحته غالباً.(۱)

بہنے والا پانی بہت لطیف شئے ہوتا ہے، عام طور پر وہ جڑوں تک پہنچ جاتا ہے۔

لہٰذا جب پانی پہنچ جاتا ہے تو استحسان کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا غسل درست ہو جائے گا، ورنہ اگر قیاس ظاہر پر عمل کیا جائے تو لوگوں کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا، اسی وجہ سے یہاں قیاس ظاہر کو چھوڑ کر قیاس خفی کی بنیاد پر حکم لگایا گیا، جس کو اصطلاح میں ''استحسان بالقیاس الخفی'' کہتے ہیں۔

اس پانی کا حکم جس میں جنبی یا حائضہ ہاتھ ڈال دے

اگر کوئی جنبی، حائضہ یا محدث ٹب یا کسی پاک پانی کے برتن میں بغیر پاک کئے اپنا ہاتھ ڈال دے اور اس ہاتھ پر بظاہر کوئی گندگی نہ ہو تو امام ابو حنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک مقتضائے قیاس کے مطابق وہ پانی ناپاک ہو جائے گا؛ کیوں کہ پانی میں ہاتھ ڈالنے کی وجہ سے ہاتھ کی نجاست زائل ہو جاتی ہے، اسی طرح پانی کے ساتھ ہونٹ لگنے سے ہونٹ کی نجاست زائل ہو جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں وہ پانی مستعمل ہونے اور نجاست کے اس میں سرایت کرنے کی وجہ سے ناپاک ہو جاتا ہے۔

مگر استحساناً وہ پانی ناپاک نہیں ہوگا، یہاں استحسان کی دو وجہ پیش کی جاتی ہیں، پہلی وجہ استحسان حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، آپؓ فرماتی ہیں:

كنت أنا ورسول الله صلى الله عليه وسلم تغتسل بإناء واحد وربما كانت تتنازع فيه الأيدي.(۲)

میں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی برتن میں غسل کرتے تھے اور بسا اوقات اس میں ہمارے ہاتھ بھی ٹکرا جاتے تھے۔

---

(۱) کبیری، باب الغسل: ۴۹

(۲) مسند احمد، مسند الصدیقہ عائشہؓ: ۳/ ۹۴، حدیث نمبر: ۲۵۹۴۱، دیکھئے: مسند الحمیدی، احادیث عائشہؓ، حدیث نمبر: ۱۶۸، مسند اسحاق بن راہویہ، ما یروی عن عروۃ ابن الزبیر الخ: ۲/ ۹۵، حدیث نمبر: ۵۵۹، مسند ابی داؤد الطیالسی، مسند القاسم عن عائشہ: ۳/ ۳۹، حدیث نمبر: ۱۵۱۹

یہ روایت قیاس ظاہر کے بالکل خلاف ہے؛ کیوں کہ اس روایت میں حضور ﷺ کے عمل سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حالت جنابت میں (جب کہ ہاتھ پر کوئی ظاہری گندگی لگی ہوئی نہ ہو) ہاتھ ڈالنے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا۔

دوسری وجہ استحسان یہ ہے کہ لوگوں کو وضوء، غسل اور پینے کے لئے پانی کی ضرورت ہے، ہر ایک سے یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ بڑے برتن سے پانی نکالنے کے لئے چھوٹا برتن رکھے اور نہ ہر شخص ایسا صاحب استطاعت ہے، ہاتھ سے پانی لینے کی ضرورت پڑتی ہے اور ہونٹ لگا کر پینے کی بھی؛ چنانچہ اگر ہاتھ اور ہونٹ کی وجہ سے پانی کے ناپاک ہونے کا حکم لگایا جائے تو لوگ سخت دشواری میں پڑ جائیں گے اور اسلام میں تنگی، دشواری اور مشقت کو دُور کیا گیا ہے، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں :

فلو لم يسقط اعتبار نجاسة اليد والشفة لوقع الناس في الحرج.(۱)

کہ اگر ہاتھ اور ہونٹ کے نجس ہونے کے معتبر ہونے سے درگذر نہ کیا جائے تو لوگ حرج میں مبتلا ہوجائیں گے۔

اسی لئے یہاں لوگوں کی ضروریات کا خیال کرتے ہوئے استحسان کی بنیاد پر حکم لگایا گیا، کہ حالت جنابت میں پاک پانی میں ہاتھ ڈالنے کی وجہ سے پانی ناپاک نہیں ہوگا؛ لہٰذا اس مسئلہ میں قیاس ظاہر کے بالمقابل دو دلیل قوی سامنے آئے، ایک حدیث اور ایک ضرورت، ان کی بنیاد پر استحسان کو زیر عمل لایا گیا، جس کو اصطلاح میں ''استحسان بالنص والضرورۃ'' کہتے ہیں۔

نماز سے متعلق چند استحسانی مسائل

بے لباس شخص کی نماز

کبھی اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ کسی کے پاس کپڑے نہ ہوں، ننگا ہو، اور نماز کا وقت سر آن پڑے اور اسے کوئی کپڑا نہ ملے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اسی حالت میں نماز پڑھ لے اور یہ اجازت بطور ضرورت

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الطہارۃ: ۱/۶۹، دیکھئے: البحر الرائق، **حكم الماء المستعمل**، احکام المیاہ: ۱/۱۰۳

ہے، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ بیان کرتے ہیں:

> حالت عجز میں بے لباس ہونا نماز جائز ہونے کے لئے مانع نہیں ہے، جب کہ ایسی حالت ہو کہ نماز کا وقت ہوجائے، اور وہ بے لباس ہو، کوئی کپڑا نہ ملے، تو ضرورت کی وجہ سے نماز جائز ہوجائے گی۔ (۱)

کیوں کہ نماز میں اصل تو یہ ہے کہ مصلی کا ستر چھپا ہوا ہو، یہی وجہ ہے کہ اگر بااختیار کوئی بغیر ستر چھپائے نماز پڑھے تو اس کی نماز نہیں ہوگی؛ لیکن اس اصل سے مذکورہ حالت کو ضرورت کی بنا پر مستثنیٰ کیا گیا کہ اگر کسی کو کپڑا حاصل نہ ہو تو مجبوری حالت میں وہ اسی حال میں نماز پڑھ لے۔

لیکن ضروری ہے کہ وہ عاری (ننگا شخص) بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھے؛ کیوں کہ یہی حالت اس کے لئے زیادہ ساتر ہے، جیسا کہ امام سرخسیؒ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کہ ہمارا مسلک وہ روایت ہے جو ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے، وہ دونوں فرماتے ہیں: کہ بے لباس شخص بیٹھ کر نماز پڑھے؛ کیوں کہ بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھنے کی حالت زیادہ ساتر ہے، ورنہ قیام، رکوع اور سجدہ کرنے میں کشف عورت کی صورت زیادہ پیش آتی ہے، جو کہ نماز اور غیر نماز دونوں حالت میں حرام ہے، اور ہر وہ رُکوع وسجود جو بغیر کشف عورت کے ممکن نہ ہو تو وہ حرام ہے اور ایسی صورت میں وہ ارکان نماز بھی باقی نہیں رہیں گے؛ لہٰذا جب وہ ارکان نماز ہونے سے ہی خارج ہیں تو ان کا ادا کرنا بھی لازم نہیں رہے گا۔ (۲)

خلاصہ یہ ہے کہ کپڑا نہ ملنے کی صورت میں ننگے شخص کی نماز ضرورت کی بنا پر ہوجائے گی، اس کو استحسان بالضرورۃ کہا جائے گا؛ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسی حالت میں بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھے۔

قرأت میں ’’ض‘‘ کی جگہ ’’ظ‘‘ پڑھ دینا

اگر کوئی شخص ’’ض‘‘ کی جگہ ’’ظ‘‘ پڑھ دے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس کی نماز فاسد

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب کتاب الصلاۃ، فصل شرائط أرکان الصلاۃ: ۱/ ۱۱۷

(۲) المبسوط للسرخسی، باب الحدث فی الصلاۃ: ۱/ ۱۸۶

ہوجائے گی اور دیگر مشائخ جیسے مطیع البلخی، محمد بن سلامہ وغیرہ کے نزدیک نماز فاسد ہوجائے گی؛ چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے:

> قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ''ض'' کی جگہ ''ظ'' پڑھنے کی وجہ سے نماز فاسد ہوجائے؛ کیوں کہ الفاظ کی تبدیلی کی وجہ سے معانی بدل جاتے ہیں، جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد اس کے قائل ہیں۔ (۱)

لیکن اگر قیاس کے حکم پر عمل کو لازمی قرار دے دیا جائے، تو عوام کو بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا؛ کیوں کہ ان کے یہاں اس طرح کے مسائل روزانہ پیش آتے رہتے ہیں؛ لہٰذا یہاں لوگوں کی اس دشواری اور مجبوری کو سامنے رکھتے ہوئے فقہاء کرام نے استحسان فرمایا، اور ضرورت کی بنیاد پر یہ حکم لگایا کہ نماز درست ہوجائے گی؛ چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے:

> بعض مشائخ نے استحسان فرمایا اور ضرورت کی وجہ سے عوام کے حق میں اور خصوصاً عجمیوں کی رعایت میں یہ حکم لگایا کہ نماز درست ہوجائے گی۔ (۲)

اس مسئلہ میں ضرورت کی بنیاد پر استحسان عمل میں آیا ہے، جس کو اصطلاح میں استحسان بالضرورۃ کہتے ہیں۔

چار رکعات تراویح ایک سلام سے پڑھنا

اگر کوئی شخص چار رکعات تراویح ایک سلام سے پڑھ لے اور دو رکعتوں پر قعدہ نہ کرے، تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی نماز فاسد ہوجائے گی؛ چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے:

> اگر کسی نے چار رکعات تراویح ایک سلام سے پڑھی اور دو رکعتوں پر قعدہ نہ کیا ہو، تو قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ جو دراصل امام محمد اور زفرؒ کا قول ہے اور ایک روایت امام ابوحنیفہؒ سے بھی ہے، کہ نماز فاسد ہوجائے گی، اور استحسان کا تقاضا یہ ہے جو کہ دراصل امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول اور امام ابو یوسف کا قول ہے، کہ نماز درست ہوجائے گی۔ (۳)

---

(۱) فتاویٰ التاتارخانیہ، کتاب الصلاۃ، مسئلۃ زلۃ القاری: ۲/ ۸۲

(۲) حوالۂ سابق: ۲/ ۸۲

(۳) حوالۂ سابق: ۳/ ۳۳۰

اس عبارت میں مقتضائے قیاس یہ لکھا ہے کہ نماز درست نہیں ہوگی، اس کی وجہ علامہ کاسانیؒ نے یہ بھی بیان فرمائی ہے :

لأن السنة أن يكون الشفع الأول كاملاً، وكماله بالعقدة، ولم توجد، والكامل لا يتأدى بالناقص.(۱)

اس لئے کہ سنت یہ ہے کہ شفع اول کامل ہو، اور اس کا کمال قعدہ پر مبنی ہے، جو یہاں پایا نہیں گیا؛ لہٰذا یہاں کامل کی ادائیگی ناقص سے نہیں ہوگی۔

یعنی شفعہ ثانی جوکہ کامل ہے، شفعہ اول جوکہ ناقص رہ گیا، اس کے ذریعہ ادائیگی نہیں ہوگی، جب ادائیگی نہیں ہوئی تو نماز بھی فاسد ہوجائے گی۔

مگر قیاس خفی کا تقاضہ یہ ہے کہ چار رکعت تراویح ایک سلام کے ساتھ درست ہوجائے گی، امام ابوحنیفہؒ کا مشہور قول، اور امام ابویوسفؒ کا قول بھی یہی ہے، جیسا کہ سابق میں تاتارخانیہ کے حوالے سے ذکر کیا گیا، انھوں نے اس مسئلہ کو قیاس کیا ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں پر جیسا کہ تاتارخانیہ میں اس کا ذکر ہے:

كذا لو صلى الأربع قبل الظهر ولم يقعد على رأس الركعتين جاز استحساناً.(۲)

جیسے کسی نے ظہر سے پہلے والی چار رکعات پڑھی اور دو رکعتوں پر قعدہ نہ کیا تو استحساناً نماز درست ہوجائے گی۔

تو جیسے یہاں چار رکعت کی ایک سلام کے ساتھ پڑھنے کی اجازت دی گئی، اسی طرح تراویح کی چار رکعتوں میں بھی استحساناً اجازت دی گئی ہے؛ چوں کہ یہاں قیاس ظاہر کو چھوڑ کر قیاس خفی کی بنیاد پر حکم لگایا گیا ہے، اس لئے اصلاح میں استحسان بالقیاس الخفی کہا جاتا ہے۔

مگر اس مسئلہ میں فتویٰ ایک دوسرے قول پر ہے جس کو فتاویٰ محمودیہ میں قاضی خاں کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے؛ چنانچہ مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں :

دو رکعت پر قعدہ نہ کرنے سے یہ دو رکعت فاسد ہوگئیں، مگر تحریمہ باقی رہا، اس پر

---

(۱) بدائع الصنائع: کتاب الصلاۃ، فصل فی سنن التراویح: ۱/ ۲۸۸

(۲) فتاویٰ التاتارخانیہ، کتاب الصلاۃ، التراویح: ۲/ ۳۳۰

دو رکعت کی بنا کی گئی، تو یہ صحیح ہوگئی، لہٰذا ان چار رکعات میں سے اخیر کی دو رکعت صحیح ہوگئیں۔(۱)

زکوٰۃ سے متعلق استحسانی مسائل

جس کو وجوبِ زکوٰۃ کا علم نہ ہو

کسی نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا اور وہیں مقیم رہا، پھر اسے معلوم ہوا کہ اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہے اور وہ ادا نہ کرسکا، پھر اسی دوران وہ دار الحرب چھوڑ کر دار الاسلام آ گیا، جہاں اسلامی احکام نافذ ہوتے ہیں ،تو کیا ایسی صورت میں اس سے دار الحرب میں واجب شدہ زکوٰۃ دار الاسلام میں لی جائے گی؟

تو قیاس ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ لی جائے ؛ کیوں کہ قبول اسلام کے ساتھ ہی انسان پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ اس کے احکام کو بھی قبول کرے ؛ لہٰذا جس وقت اس نے دار الحرب میں اسلام قبول کیا، اسی وقت اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی نافذ ہوگیا، جب وجوب نافذ ہوگیا تو صاحب نصاب ہونے ،اور حولانِ حول گزرنے پر زکوٰۃ کا ادا کرنا بھی واجب ہوگیا۔

اب رہی بات اس کے عدم واقفیت کی کہ اس پر زکوٰۃ تو واجب تھی مگر وہ اس سے ناواقف تھا،تو اس سلسلے میں شریعت کا ایک اُصول ہے کہ جہالت گناہوں کی معافی میں تو عذر مانی جاسکتی ہے ؛ مگر اسباب کے پائے جانے کے وقت واجبات کے اسقاط میں نہیں،جیسا کہ امام سرخسیؒ کا قول ہے :

> اور قیاس وہ ہے جس کو فرمایا گیا کہ قبول اسلام کی وجہ سے احکام کو بھی قبول کرنے والا ہوجاتا ہے،مگر رہی بات اس کے عدم واقفیت کی تو اس کی جہالت (عدم واقفیت) گناہوں کی معافی میں تو عذر ہوسکتی ہے،مگر سبب ثابت ہونے کے بعد واجبات کے اسقاط میں نہیں۔(۲)

یعنی زکوٰۃ اس پر واجب تھی تو یہ وجوب عدم واقفیتِ وجوبِ زکوٰۃ کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا، جب علم ہوگا،اس پر ادائیگی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ: ۲/ ۲۶۳

(۲) المبسوط للسرخسی، کتاب الزکوٰۃ، زکوٰۃ الابل: ۲/ ۱۸۷

لیکن یہاں استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے زکوٰۃ نہ لی جائے؛ کیوں کہ جب اس نے اسلام قبول کیا، اس وقت وہ حمایت اسلام میں داخل نہیں تھا، اور جب اسے یہ معلوم ہی نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے، تو اس پر ادائیگی زکوٰۃ بھی لازم نہیں ہوگی؛ چنانچہ امام سرخسی لکھتے ہیں:

> کسی انسان پر شریعت کا حکم اس وقت نافذ ہوتا ہے، جب اس حکم کی خبر اس تک پہنچ جائے، اگر کوئی حکم نہ پہنچے تو وہ اس کا مکلف نہیں ہوتا، جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اہل قباء تحویل قبلہ کے بعد بھی بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے اور وہ ان کے لئے جائز تھا؛ کیوں کہ ابھی ان کے پاس تحویل قبلہ کی خبر نہیں پہنچی تھی۔[۱]

لہٰذا یہاں بھی وہی حکم لگایا جائے گا کہ جب وہ دارالحرب میں تھا اور وجوب زکوٰۃ کا حکم اس تک نہیں پہنچا تھا تو اس پر زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوئی، جب واجب نہیں ہوئی تو ادا کرنا بھی لازم نہیں ہوگا؛ چوں کہ یہاں قیاس ظاہر کے مقابلہ میں قیاس خفی کی بنیاد پر حکم لگایا گیا، اسی لئے اس کو ''استحسان بالقیاس الخفی'' کہا جائے گا۔

زکوٰۃ کی نیت کے بغیر تمام مال صدقہ کر دینا

فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کے لئے نیت مقارنہ شرط ہے، یعنی جس وقت ہم اپنے مال میں سے مقدار واجب نکالیں، اسی وقت نیت کریں، یا جس وقت ہم کسی مستحق کو مال زکوٰۃ ادا کریں، اس وقت ہماری نیت ہو؛ لیکن فقہاء کا اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ جس پر زکوٰۃ واجب ہو، وہ اپنا تمام مال بغیر نیت زکوٰۃ کے صدقہ کر دے، تو کیا ایسی صورت میں اس کی زکوٰۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

تو اس سلسلے میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی نہ ہو؛ کیوں کہ زکوٰۃ فرض ہے، اور صدقہ نفل، اور نفل کام میں فرض کی تخصیص کے لئے اس کی علاحدہ نیت ضروری ہے، جیسے مطلقاً نماز ادا کرنا نفل ہے، اگر فرض کے وقت میں فرض کی نیت نہ ہو تو فرض کی ادائیگی نہیں ہوگی، اسی طرح صدقہ کرنا نفل ہے، اگر تمام مال صدقہ کریں اور فرض کی نیت نہ کریں تو فرض کی ادائیگی نہیں ہوگی؛ کیوں کہ اس میں زکوٰۃ کا واجبی حصہ غیر متعین ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی متعین مال سے ہی ہوتی ہے۔

---

(۱) المبسوط للسرخسی، کتاب الزکوٰۃ، زکوٰۃ الابل: ۲/ ۱۸۷

مگر استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ اسی مال سے اس کے فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہوجائے گی؛ کیوں کہ جس مال کو پورا پورا صدقہ کیا گیا ہے، اس میں مال زکوٰۃ خود بخود متعین تھا، جیسا کہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں :

ومن تصدق بجميع ماله، لا ينوي الزكاة سقط فرضها عنه استحساناً، لأن الواجب جزء منه، فكان متعينا فيه، فلا حاجة إلى التعيين.(۱)

جو اپنا تمام مال صدقہ کردے، اور زکوٰۃ کی نیت نہ کرے، تب بھی اس کی جانب سے استحساناً فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہوجائے گی، کیوں کہ اس مال میں زکوٰۃ کے لئے واجبی حصہ خود بخود متعین تھا، تو الگ سے تعیین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

مطلب یہ ہے کہ جس وقت تمام کا صدقہ ہوا، ساتھ ہی مال زکوٰۃ بھی ادا ہوگیا، یعنی خود بخود ضمن میں تعین کی نیت پائی گئی، ورنہ اگر قیاسی حکم پر عمل کیا جائے کہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، تو لوگ ایک عبادت کی ادائیگی، اور فریضہ سے محروم رہیں گے، ساتھ ہی وہ زکوٰۃ ادا کرنے کی وجہ سے گنہگار بھی ہوں گے، تو گویا اس میں بندوں کی ایک مصلحت ہے کہ کبھی اگر ایسی کوئی اتفاقی صورت پیش آجائے تو وہ فرض عبادت کی انجام دہی سے محروم نہ ہوں، اور شریعت میں مصلحت کی رعایت کی گئی ہے، اسی لئے یہاں قیاس ظاہر کو چھوڑ کر مصلحت کی بنیاد پر حکم لگایا گیا، جو دراصل استحسان ہی ایک صورت ہے، جس کو اصطلاح میں ''استحسان بالمصلحۃ'' کہتے ہیں۔

بیوی اور بالغ اولاد کی جانب سے صدقہ فطر کی ادائیگی

شوہر بیوی کی جانب سے صدقہ فطر ادا نہیں کرے گا، اس لئے کہ اسلام نے معاشی اعتبار سے عورت کے وجود کو مستقل مانا ہے، وہ اپنی املاک میں ہر طرح کے تصرف کا پورا حق رکھتی ہے، شوہر اس کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں کسی طرح کے تصرف کا مجاز نہیں، پس ظاہر ہے کہ صدقہ فطر کی ادائیگی بھی خود بیوی ہی کی ذمہ داری ہوگی، نہ کہ شوہر کی، جیسا کہ صاحب ہدایہ صراحت کرتے ہیں:

ولا يؤدي عن زوجته لقصور الولاية والمؤنة، فإنه لا يليها في غير حقوق النكاح، ولا يمونها في غير الرواتب

(۱) ہدایہ، کتاب الزکوٰۃ: ۱/ ۹۶

کالمداواۃ. (۱)

شوہر اپنی بیوی کی طرف سے صدقہ فطر ادا نہیں کرے گا؛ کیوں کہ اس سے متعلق ولایت و مؤنت دونوں ناقص ہیں، اس لئے کہ شوہر حقوق نکاح کے علاوہ میں اس کا والی نہیں ہے اور ثابت شدہ اُمور میں شوہر بیوی کی مؤنت بھی برداشت نہیں کرسکتا جیسے دوا وغیرہ۔

ولایت ناقص ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے حقوق کے علاوہ دیگر چیزوں میں شوہر بیوی پر کسی بھی چیز کا والی اور ذمہ دار نہیں ہے اور مؤنت اس لئے ناقص ہے کہ ثابت شدہ اُمور مثلاً: سکنی، نفقہ اور کسوہ کے علاوہ کسی دوسری چیز جیسے علاج ومصالجہ کا خرچ برداشت کرنا، شوہر کے ذمہ نہیں ہے۔

لہٰذا جب شوہر کی ولایت اور مؤنت دونوں ناقص ہیں تو ظاہر ہے کہ اس پر بیوی کا صدقہ فطر بھی واجب نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اس کے لئے کامل مؤنت اور کامل ولایت ضروری ہے، اور جیسے بیوی کی جانب سے صدقہ فطر ادا کرنا واجب نہیں ہے، ویسے ہی بالغ اولاد کی جانب سے بھی صدقہ فطر ادا کرنا واجب نہیں ہوگا؛ چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

ولا عن أولاده الكبار و إن كانوا في عياله.(۲)

اور نہ ہی باپ اپنی بالغ اولاد کی جانب سے صدقہ فطر ادا کرے، ہر چند کہ وہ اس کے عیال (زیر پرورش) ہوں۔

ان تمام تر تفصیلات کے پیش نظر قیاس اس بات کا متقاضی ہے کہ بیوی اور بالغ اولاد کی جانب سے صدقہ فطر ادا کیا جائے تو ادا نہیں ہوگا اور نہ ذمہ سے فریضہ ساقط ہوگا، بیوی کی جانب سے تو اس لئے کہ اس میں ولایت اور مؤنت دونوں ناقص ہیں اور بالغ اولاد کی جانب سے اس لئے کہ اس میں بھی نقصان ولایت موجود ہے۔

لیکن فقہاء فرماتے ہیں کہ استحسان کی رو سے دونوں کی جانب سے صدقہ فطر ادا ہوجائے گا اور خاص طور پر ہندوستان کے ماحول میں، جیسا کہ اس مسئلہ پر ہمارے فقہاء کی صراحت موجود ہے؛ چنانچہ استاذ محترم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

---

(۱) ہدایہ، باب صدقۃ الفطر: ۲/ ۲۳۰

(۲) حوالہ سابق: ۲/ ۲۳۰

میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے موجودہ معاشرہ میں معاشی اعتبار سے زوجین جس طرح ایک دوسرے کی املاک میں تصرف کرتے ہیں، اس کے تحت عام طور پر دونوں کی جائداد میں کوئی تشخص اور امتیاز نہیں رہتا، اس لئے ان حالات میں شوہروں کو بیویوں کی طرف سے بھی صدقہ فطر ادا کردینا چاہئے۔ (۱)

جس کی مزید وضاحت صاحب ہدایہ کے اس قول سے ہوجاتی ہے:

اگر باپ اپنی بالغ اولاد اور اپنی بیوی کی طرف سے ان کی اجازت کے بغیر صدقہ فطر ادا کردے تو استحساناً جائز ہوگا؛ کیوں کہ عادۃ اجازت ثابت ہے۔ (۲)

اور یہ ضابطہ ہے کہ "الثابت عادة كالثابت بالنص" (۳)، یعنی عادۃ ثابت ہونے والی چیز ایسی ہے جیسے نص کی بنیاد پر ثابت ہو، تو معلوم یہ ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنی بالغ اولاد، اور اپنی بیوی کی جانب سے صدقہ فطر ادا کردے اور وہ بغیر اجازت کے ہو اور اس طرح دینے کا عرف بھی ہو، تو صدقہ فطر ادا ہوجائے گا۔
چوں کہ یہاں قیاس ظاہر کے مقابلہ میں قیاس خفی کی بنیاد پر استحسان کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ یہاں "استحسان بالقیاس الخفی" پایا گیا۔

روزہ سے متعلق استحسانی مسائل

جب کوئی شخص ایک روزہ میں قضاء اور کفارۂ ظہار کی نیت کرے

اگر کسی شخص نے ایک ہی دن میں رمضان کے روزہ کی قضاء اور کفارہ ظہار کی نیت کی تو کیا اس میں دونوں کی ادائیگی ہوجائے گی، یا ایک کی طرف سے کافی ہوگا؟ امام محمدؒ کے نزدیک قیاس یہ ہے کہ وہ روزہ نہ ہی قضاء کی جانب سے ادا ہوگا اور نہ ہی کفارہ ظہار کی جانب سے؛ بلکہ وہ ایک نفلی روزہ مانا جائے گا؛ چنانچہ علامہ کاسانیؒ وجہ قیاس بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) کتاب الفتاویٰ، صدقہ فطر کے احکام: ۳/۳۵۶

(۲) ہدایہ، باب صدقۃ الفطر: ۲/۲۳۰

(۳) فتح القدیر، باب صدقۃ الفطر: ۲/۲۸۶

أن جهتي التعين تعارضتا للتنافي فسقطتا بحكم التعارض فبقي فيه مطلق الصوم فيكون تطوعاً.(۱)

جب جہات تعین ایک دوسرے کے خلاف ہوں تو وہ دونوں تعارض کے حکم کی وجہ سے ساقط ہوجاتی ہیں اور مطلق روزہ کی نیت باقی رہ جاتی ہے؛ چنانچہ وہ روزہ ایک نفلی روزہ مانا جائے گا۔

لیکن قیاس خفی (استحسان) کا تقاضا یہ ہے کہ قضائے رمضان اور کفارہ ظہار کے روزوں میں قضائے رمضان کو ترجیح حاصل ہے؛ کیوں کہ وہ رمضان کے روزے کا بدل ہے اور کسی چیز کا بدل اصل کے قائم مقام ہوتا ہے اور اصل (رمضان کا روزہ) تمام روزوں میں قوی ہے، حتی کہ اس کی وجہ سے دیگر تمام روزوں کی نیت ختم ہوجاتی ہے۔

اور دوسری وجہ استحسان یہ ہے کہ قضاء صوم ایسے روزہ کا بدل ہے جو کہ ابتداء سے ہی اللہ تعالیٰ کے واجب کرنے سے واجب ہوا ہے، اور کفارہ ظہار کا روزہ وہ ہے جو اس سبب کی بنیاد پر واجب ہوا ہے جو بندے کی جانب سے پایا گیا ہو؛ لہٰذا ان اسباب ترجیح کو سامنے رکھتے ہوئے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قضاء رمضان زیادہ قوی ہے اور کفارہ ظہار ضعیف ہے اور یہ ضابطہ ہے کہ جب قوی اور ضعیف کا ٹکراؤ ہو تو ترجیح قوی کو ہوتی ہے، جس کی مزید صراحت علامہ کاسانیؒ کی اس عبارت سے ہوجاتی ہے:

قضاء رمضان ایسے روزے کا بدل جو اللہ تعالیٰ کے واجب کرنے سے واجب ہوا ہے اور کفارۂ ظہار ایسا روزہ ہے جو بندے کے کسی فعل کی بنیاد پر واجب ہوا ہے، تو اس اعتبار سے قضائے رمضان کا روزہ قوی ہوا، اور قوی کی ضعیف سے مزاحمت نہیں ہوتی ہے۔(۲)

فتاویٰ ہندیہ میں بھی اس کو بیان کیا گیا ہے :

ولو نوىٰ قضاء رمضان وكفارة الظهار كان عن القضاء استحساناً.(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، کتاب الصوم، باب کیفیۃ النیۃ: ۲/ ۸۵　　(۲) بدائع الصنائع، فصل شرائط انواع الصیام: ۲/ ۸۵

(۳) ہندیہ، کتاب الصوم، باب فی تعریفہ الخ: ۱/ ۱۹۷

اگر کوئی قضاء رمضان اور کفارہ ظہار کی نیت کرے تو وہ روزہ قضاء رمضان کی طرف سے ادا ہوگا استحساناً۔

خلاصہ یہ ہے کہ قیاس ظاہر تو وہ ہے جو امام محمدؒ نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے کسی کی ادائیگی نہیں ہوگی ؛ بلکہ وہ نفل روزہ مانا جائے گا، مگر قیاس خفی یعنی استحسان کا تقاضا یہ کہ وہ روزہ رمضان کے روزہ کا قضا ہوگا، چنانچہ یہاں قیاس ظاہر کو چھوڑ کر قیاس خفی کی بنیاد پر حکم لگایا گیا ہے، جس کو اصطلاح میں ''استحسان بالقیاس الخفی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بھول کر روزہ افطار کرنے کا حکم

روزہ کے دن میں کھانے، پینے اور جماع سے رکنا یہ روزے کا ایک رکن ہے، اس کے بغیر روزہ مکمل نہیں ہوسکتا، اس کے علاوہ ان چیزوں کو روزہ کی رات میں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تمہارے لئے حلال کر دیا گیا ہے کہ روزوں کی رات میں تم اپنی بیویوں سے بے تکلف صحبت کرو، وہ تمہارے لئے لباس ہیں، اور تم ان کے لئے لباس ہو، اللہ کو علم تھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے، پھر اس نے تم پر عنایت کی، اور تمہاری غلطی معاف فرمادی؛ چنانچہ اب تم ان سے صحبت کرلیا کرو، اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے لکھ رکھا ہے، اسے طلب کرو، اور اس وقت تک کھاؤ پیو جب تک صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے ممتاز ہو کر تم پر واضح (نہ) ہو جائے۔ (۱)

پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں (کھانے، پینے، جماع) سے دن میں رُکنے کا حکم فرمایا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ.﴾ (۲) کہ تم روزوں کو رات تک پورا کرو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھانے، پینے، اور جماع سے رُکنا یہ روزے کا رکن ہے۔

چنانچہ اسی اصل پر اس چیز کی بنیاد رکھی گئی جو روزے کو فاسد کر دیتی ہے، یعنی ناقض صوم کی، اور وہ ناقض صوم مذکورہ اشیاء کا انجام دینا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اشیاء سے رُک جانا یہ روزے کا رکن ہے، جو

---

(۱) البقرۃ: ۱۸۷ (۲) حوالۂ سابق

مذکورہ اشیاء کی انجام دہی یعنی کھانے، پینے اور جماع کرنے سے، خواہ وہ (کھانا، پینا، جماع کرنا) صورۃً ومعنیً دونوں طریقے سے ہو، یا صرف صورۃً ہو معنیً نہ ہو، عذر کی وجہ سے ہو یا بغیر عذر کے، عمداً ہو یا خطاءً، طوعاً ہوں یا کرہاً، ہر صورت میں رکن کے فوت ہونے کی وجہ سے اصل شئ فوت ہوجاتی ہے اور اصل شئ وہ روزہ ہے، اسی پس منظر میں یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی بھول کر کھالے، یا پی لے تو اس کا کیا حکم ہے؟

تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ روزہ فاسد ہوجائے گا، اگرچہ بھول کو ہی کیوں نہ ہو، یہی امام مالکؒ کا قول ہے، کہ روزہ کے رکن کی ضد (کھانے، پینے) کے پائے جانے کی وجہ سے روزہ فاسد ہوجائے گا؛ لہٰذا اس کی قضاء لازم ہوگی، یہی ایک قول امام ابوحنیفہؒ سے بھی منقول ہے، مگر آپ نے فرمایا کہ ہم نے روایت کے مقابلہ میں قیاس کو ترک کردیا، جس کو علامہ کاسانیؒ نے اس طرح بیان ہے:

> امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: کہ لوگ نہ کہیں تو میں کہوں کہ وہ قضاء کرے گا، یعنی اگر لوگ یہ نہ کہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے حکم کی مخالفت کی تو میں کہوں گا کہ وہ شخص قضاء کرے گا؛ لیکن ہم نے نص کی وجہ سے قیاس کو ترک کردیا اور وہ نص یہ ہے کہ جس کو حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھالے یا پی لے تو وہ اپنے روزہ کو مکمل کرے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا اور اللہ ہی نے اسے پلایا ہے''۔(۱)

اس سے آگے علامہ کاسانیؒ نے امام صاحب کی ایک دوسری روایت اور بیان کی ہے جس میں امام صاحبؒ کی رائے بالکل مختلف ہے؛ چنانچہ لکھتے ہیں:

> وروي عن أبي حنيفة أنه قال: لا قضاء على الناسي للأثر المروي عن النبي صلى الله عليه وسلم.(۲)
>
> امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: کہ ناسی (بھول کر کھانے پینے والے) پر قضاء نہیں ہے، اس حدیث کی وجہ سے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل أركان الصيام: ۲/۹۱

(۲) حوالۂ سابق

اسی روایت کے مطابق فقہاءِ احناف کا استحسان ہے کہ اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ روزوں کی قضاء کرے گا، اسی کو علامہ کاسانی نے امام ابو یوسفؒ اور صحابہ میں سے حضرت علیؓ، ابن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ کا مسلک قرار دیا ہے؛ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> لیکن اثر کی پیروی زیادہ اولیٰ ہے جب کہ وہ صحیح ہو؛ چنانچہ امام ابو یوسف اس حدیث کی پرکھ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث شاذ نہیں ہے اور ہم نے اس حدیث کے شاذ ہونے کی بات کی پوری جرأت سے تردید کی ہے؛ کیوں کہ امام ابو یوسف بھی حدیث کے اعلیٰ ناقدین میں سے تھے۔ (۱)

چنانچہ حضرت علی، ابن عمر، اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کا مسلک بھی ہمارے مطابق ہے؛ چنانچہ یہاں جو استحسان ہے وہ دو بنیادوں پر ہوا ہے، پہلے نص کی بنیاد پر جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> من نسی وهو صائم فأكل أو شرب فليتم صومه فان الله عزوجل أطعمه وسقاه. (۲)
>
> کہ جو شخص روزے کی حالت میں بھولے کر کھالے یا پی لے تو وہ اپنا روزہ مکمل کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا ہے اور اللہ ہی نے اسے پلایا ہے۔

اس روایت میں صاف وضاحت ہے کہ کوئی شخص روزے کی حالت میں کھالے یا پی لے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا؛ بلکہ اس کے باقی رکھنے کا ہی حکم دیا گیا ہے اور صادر ہونے والے عمل کی اللہ کی جانب نسبت کی گئی؛ کیوں کہ وہ عمل انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوا ہے۔ اور استحسان کی دوسری بنیاد ''قیاس خفی'' ہے، وہ یہ ہے کہ روزوں میں نسیان کا وجود اکثر و بیشتر پایا جاتا ہے؛ لہٰذا دفع حرج کے لئے اس کو عذر قرار دیا گیا۔ (۱) تو اس اعتبار سے نسیان کی بنیاد پر روزہ کے فساد کا حکم نہیں لگایا جائے گا؛ کیوں کہ اس میں بندوں کے لئے حرج و مشقت ہے اور اسلام میں مشقت کو دور کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں قیاس ظاہر کے مقابلہ میں نص اور ضرورت کی بنیاد پر استحسان عمل میں آیا، جس کو اصطلاح میں ''استحسان بالنص والضرورۃ'' کا جاتا ہے۔

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل أرکان الصیام: ۲/۹۱

(۲) بخاری، باب الصائم إذا أکل، حدیث نمبر: ۱۹۳۳، صحیح ابن خزیمہ، باب ذکر البیان أن الآکل والشارب، حدیث نمبر: ۱۹۸۹

دانتوں کے درمیان اٹکی ہوئی چیز کا نگل جانا

روزہ میں اگر کوئی شخص دانتوں کے درمیان اٹکی ہوئی چیز کو نگل جائے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا، اگر چہ جان بوجھ کر اسے حلق میں لے جائے، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

ولو بقي بين أسنانه شيء فابتلعه ... أنه لا يفسد صومه، وإن أدخله حلقه متعمداً.(۱)

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر جان بوجھ کر نگل جائے تو اس کا روزہ فاسد ہوجائے گا، ایسی صورت میں اس پر قضاء تو لازم ہوگی؛ لیکن کفارہ لازم نہیں ہوگا، امام ابو یوسفؒ کی اسی رائے کی ابن ابی مالک نے موافقت کی ہے، فرماتے ہیں:

إن كان مقدار الحمصة، أو أ كثر يفسد صومه وعليه القضاء ولا كفارة ... و إن كان دون الحمصة لا يفسد صومه.(۲)

کہ اگر دانوں کے درمیان اٹکی ہوئی چیز چنے کے برابر یا اس سے زیادہ ہو اور وہ اسے نگل جائے تو اس کا روزہ فاسد ہوجائے گا اور اگر اٹکی ہوئی چیز چنے سے چھوٹی ہے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

چنانچہ اس مسئلہ میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ عام حالات میں جیسے چنا، یا اس سے چھوٹی چیز کے کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اسی طرح دانتوں کے درمیان اٹکی ہوئی چیز (اگر چہ وہ چنے کے برابر یا اس سے کم ہو) سے بھی روزہ فاسد ہوجائے گا۔

مگر استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ اتنی چھوٹی چیز سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

أن ما دون الحمصة يسير يبقى بين الأسنان عادة، فلا يمكن التحرز عنه بمنزلة الريق، فيشبه الناسي ولا كذلك قدر الحمصة.(۳)

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل أركان الصيام: ۹۱/۲ (۲) حوالۂ سابق

(۳) حوالۂ سابق

کہ دانتوں کے درمیان اٹکی ہوئی چیز اگر چنے سے کم ہے، تو وہ ایک شئ قلیل ہے، جو عام طور سے دانتوں میں اٹکی رہ جاتی ہے، اور جس سے احتراز بھی ممکن نہیں ہے، تو گویا وہ تھوک کے درجہ میں ہو گیا، جو کہ ناسی کے مشابہ ہے، (کہ اگر کسی نے بھولے سے کوئی چیز کھالی تو روزہ نہیں ٹوٹے گا)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چنا یا اس سے چھوٹی چیز جو اٹکی ہوئی ہو، اگر اندر چلا جائے، یعنی وہ نگل جائے تو اس کا روزہ استحساناً فاسد نہیں ہوگا۔

دیکھائے تو یہاں استحسان کی دلیل ضرورت ہے، اسی وجہ سے اس کو ''استحسان بالضرورۃ'' کہا جائے گا۔

حج سے متعلق استحسانی مسائل

حج اسلام (فرض حج) مطلق نیت سے صحیح ہو جاتا ہے

اگر کسی شخص نے حج کا احرام باندھا، اور اس نے حج اسلام متعین نہیں کیا، جب کہ اس پر ابھی حج اسلام باقی تھا، تو قیاس ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی طرف سے حج اسلام ادا نہیں ہوگا؛ بلکہ نفل ادا ہوگا؛ کیوں کہ اس کی طرف سے تعیین نہیں پائی گئی کہ وہ نفل حج ادا کر رہا ہے، یا حج اسلام جو اس پر فرض ہے۔

چنانچہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

والقياس أن لا يقع عن حجة الإسلام إلا بتعين النية.(۱)

کہ قیاس کی رو سے بغیر تعین نیت کے حج اسلام واقع نہیں ہوگا۔

وجہ قیاس یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں مختلف چیزیں ہو سکتی ہیں، جیسے ایک ہی وقت میں نفل کی ادائیگی بھی ہو سکتی ہے اور فرض کی بھی، ایک ہی وقت میں نفل حج کی ادائیگی بھی ہو سکتی ہے اور فرض حج کی بھی، جس کے لئے تعین ضروری ہے، اور مذکورہ صورت میں اس نے عمل متعین نہیں کیا، یعنی حج اسلام کو متعین نہیں کیا، تو اس کی طرف سے حج اسلام واقع نہیں ہوگا؛ بلکہ نفل حج ادا ہوگا، جیسا کہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

وجه القياس أن الوقت يقبل الفرض والنفل فلا بد من التعين بالنية.(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل بیان مکان الأحرام: ۲/ ۱۶۳

(۲) بدائع الصنائع، فصل بیان مایصیر بہ محرماً: ۲/ ۱۶۳

وجہ قیاس یہ ہے کہ وقت فرض کو بھی قبول کرتا ہے اور نفل کو بھی تو ایسی صورت میں نیت کے ذریعہ تعین ضروری ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بغیر تعین نیت کے فرض حج ادا نہیں ہوگا؛ لیکن استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حج فرض حج کی جانب سے ادا ہوگا نہ کہ نفل۔

جیسا کہ علامہ کاسانیؒ نے لکھا ہے:

لیکن استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ بظاہر جس وقت اس پر حج اسلام فرض ہے، وہ تو اسی کا احرام باندھے گا، نہ کہ نفل کا، اور وہ اپنا ذمہ فرض سے بری کرنا چاہے گا، نہ کہ نفل سے، پس اس اعتبار سے اس حج کو دلالت حال کی بنا پر حج اسلام (جو کہ اس کے ذمہ واجب ہے) ہی پر محمول کیا جائے گا؛ کیوں کہ اس میں خود بخود تعیین پائی گئی، جیسے رمضان کے روزوں میں مطلق نیت سے رمضان کا روزہ ہی ادا ہوگا اور وہ نیت نفل روزوں کی طرف نہیں ہوسکتی، ایسے ہی یہاں بھی بغیر تعیین کے مطلق نیت سے حج اسلام ہی ادا ہوگا۔ (۱)

یہاں استحسان قیاس خفی کی بنیاد پر ہوا ہے، جس کو اصطلاح میں استحسان بالقیاس الخفی کہا جاتا ہے۔

دس ذی الحجہ میں وقوفِ عرفہ ہو جائے؟

اگر لوگوں پر ذی الحجہ کا چاند مشتبہ ہو جائے اور لوگ ذی قعدہ کے تیس دن مکمل کرنے کے بعد ایک دن وقوف عرفہ کریں، پھر کچھ ایام کے بعد کچھ لوگ گواہی دیں کہ انھوں نے فلاں دن چاند دیکھا ہے اور یہ واضح ہو جائے کہ وہ دن (جس میں وقوف عرفہ کیا) یوم النحر تھا، تو قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ نہ ان کا وقوف صحیح ہوا اور نہ ہی حج تام ہوا۔

جیسا کہ علامہ کاسانیؒ لکھتے ہیں:

أنهم، وقفوا في غير وقت الوقوف فلا يجوز كما لو تبين

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل بیان مایصیر بہ محرماً: ۲/ ۱۶۳

أنهم، وقفوا يوم التروية.[1]

لوگوں نے وقوف کے وقت کے علاوہ میں وقوف کیا تو یہ جائز نہیں ہے، جیسا کہ (وقوف اس وقت جائز نہیں) جب یہ واضح ہوجائے کہ انھوں نے آٹھ ذی الحجہ (یوم الترویہ) میں وقوف کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وقوف کا وقت نو ذی الحجہ (یوم عرفہ) ہے؛ لہٰذا اگر دوسرے دنوں میں وقوف کیا ہوتو وہ جائز نہیں ہوگا، اور جب وقوف عرفہ صحیح نہیں ہوا تو حج بھی مکمل نہیں ہوگی۔

لیکن فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ استحسان کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا وقوف صحیح ہوجائے گا اور حج بھی تمام ہوجائے گی، وجہ استحسان نبی کریم ﷺ کی وہ حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صومكم يوم تصومون وأضحاكم يوم تضحون وعرفكم يوم تعرفون وروى حجكم يوم تحجون.[2]

تمہارا روزہ اس دن ہے جس دن لوگ روزہ رکھیں اور تمہاری قربانیاں اس دن ہیں جس دن لوگ قربانی کریں اور تمہارا وقوف عرفہ اس دن ہے جس دن لوگ وقوفِ عرفہ کریں اور ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ تمہارا حج اس دن ہے، جس دن لوگ حج کریں۔

لہٰذا اس حدیث میں حضور ﷺ نے وقت وقوف اور وقت حج اس دن بتایا ہے، جس میں لوگ وقوف کریں، اور جس دن لوگ حج کریں تو مذکورہ مسائل میں بھی لوگوں پر جب معاملہ مشتبہ ہوگیا اور انھوں نے یوم نحر میں وقوف عرفہ کیا، تو یہ درست ہے؛ کیوں کہ معاملہ مشتبہ ہونے کی صورت میں ان لوگوں کا وقوف عرفہ حدیث کی رو سے وہی معتبر ہوگا، جس دن ان تمام لوگوں نے وقوف عرفہ کیا۔

رہی یہ بات کہ بعد میں آ کر کچھ لوگوں نے چاند دیکھنے کی شہادت دی اور معاملہ واضح ہوگیا کہ انھوں نے ''یوم نحر'' میں وقوف عرفہ کرلیا تو اس شہادت کے بارے میں فقہاء نے دو بات فرمائی ہے۔

جیسا کہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں :

ان میں سے ایک بات وہ ہے جو ہمارے بعض مشائخ نے فرمائی ہے کہ یہ شہادت

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل رکن الحج الخ: ۲/ ۱۲۷

(۲) الجامع الصحيح للسنن والمسانيد: ۲۹/ ۲۰۷

نفی پر قائم ہے اور وہ نفی حج کے جواز کی ہے اور نفی پر شہادت باطل ہے، دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کی شہادت تو جائز ہوجائے گا، اس لئے کہ یہ مشتبہ معاملہ کی ایسی قسم ہے جو عام طور پر پیش آتی رہتی ہے اور جس سے بچنا بھی ناممکن ہے۔ (۱)

اس لئے یہاں ضرورت کو بنیاد بناتے ہوئے بھی استحسان کیا گیا، اس اعتبار سے یہاں استحسان بالنص والضرورۃ دونوں ہی پائے گئے۔

اہل میقات کے لئے اِحرام باندھنے کا حکم

جو لوگ میقات کے اندر آتے جاتے رہتے ہیں، ان کے لئے ضرورت کی بنا پر یہ جائز ہے کہ وہ بغیر احرام کے داخل ہوں؛ کیوں کہ ان کا مکہ میں اکثر آنا جانا لگا رہتا ہے اور ان حضرات پر ہر مرتبہ احرام لازم کرنے میں واضح طور پر مشقت لازم آتی ہے؛ لہٰذا ایسی صورت میں ان کو اہل مکہ کے درجہ میں رکھا گیا ہے اور ان کے لئے اس کو جائز رکھا گیا کہ وہ مکہ میں جب چاہیں ضرورت کی بنیاد پر بغیر احرام کے آمد ورفت کرسکتے ہیں۔

چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

فصار كأهل مكة حيث يباح لهم الخروج منها ثم دخولها بغير إحرام لحاجتهم. (۲)

تو وہ (اہل میقات) اہل مکہ کی طرح ہوجائیں گے، اسی بنا پر ان کی ضرورتوں کے پیش نظر مکہ سے نکلنا اور داخل ہونا ان کے لئے مباح قرار دیا گیا۔

یہاں قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ سرزمین مکہ کا جو حصہ حرم ہے، اس میں داخل ہونے کے لئے احرام ضروری ہے، خواہ داخل ہونے والا باہر کا ہو، یا وہ داخل میقات کا ہو۔

مگر فقہاء کرام نے یہاں استحسان فرمایا کہ جن لوگوں کا میقات میں آنا جانا لگا رہتا ہے تو ان کا آنا جانا ایک ضرورت ہے اور ضرورت کی بنیاد پر ان کو اہل مکہ کے درجہ میں رکھا گیا، اور یہ حکم لگایا گیا کہ جس طرح اہل مکہ پر احرام لازم نہیں، اسی طرح داخلین میقات پر بھی احرام لازم نہیں ہوگا، یہاں استحسان ضرورت کی بنیاد پر ہوا ہے، اسی لئے اس کو ''استحسان بالضرورۃ'' سے تعبیر کیا جائے گا۔

---

(۱) بدائع الصنائع، فصل رکن الحج: ۲/۱۲۶ (۲) ہدایہ، فصل فی المواقیت التی لا یجوز الخ: ۱/۱۳۴

سائبر جرائم اور اسلامی نقطہ نظر

محمد اسامہ ادریس ندوی ❖

انٹرنیٹ کی برق رفتاری کی وجہ سے تجارت میں حیرت انگیز انقلاب آیا ہے، لاکھوں کروڑوں روپیوں کا روزانہ کا لین دین گھر بیٹھے انٹرنیٹ کے ذریعہ ہونے لگا ہے، ایسے ہی انٹرنیٹ کے ذریعہ سے بنائے گئے پروگرام وسافٹ ویئر بھی اب مستقل مال کی حیثیت رکھتے ہیں، اس وجہ سے اب چوروں نے تجوریوں پر ڈاکہ ڈالنا ختم کر دیا ہے، وہ اب کھلے عام انٹرنیٹ پر چوری کرتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی کبھی پوری کمپنی کا دیوالیہ نکل جاتا ہے۔

الیکٹرانک سرمایہ

انٹرنیٹ کے ذریعہ اقتصادیات پر حملے کے بارے میں بات کرنے سے پہلے زیادہ مناسب ہے کہ الیکٹرانک سرمایہ کی تعریف کی جائے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر عبدالعزیز بن ابراہیم الشبل لکھتے ہیں:

> الیکٹرانک اشیاء میں پروگرام/سوفٹ ویئر، ویب سائٹ کا نام وغیرہ ہیں، اور یہ تمام کی تمام غیر حسی ہیں، کیا ہم ان کو معنوی اشیاء تسلیم کرتے ہوئے مال کہہ سکتے ہیں؟ راجح قول کے مطابق جس کو لوگ مال تسلیم کرنے لگیں اور اس کے ذریعہ سے جائز نفع حاصل ہونے لگے اس شرعی طور پر مال متقوم مانا جاتا ہے۔[1]

سوفٹ ویئر سے متعلق احکام

سوفٹ ویئر اور پروگرام کے سرقہ میں بات کرنے سے پہلے زیادہ مناسب ہے کہ سوفٹ ویئر کے

❖ فاضل المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

(۱) الاعتداء الإلكتروني: ۱۹۸

لئے فقہی ضوابط مقرر کر دیے جائیں، اس کے ذریعہ سے سوفٹ ویئر اور پروگرام کے سرقہ پر مرتب ہونے والے احکامات کو جاننے میں مدد ملے گی۔

کمپیوٹر کو دی جانے والی تعلیمات وہدایات کا منظّم مجموعہ جس کے ذریعہ سے کمپیوٹر مطلوبہ کام پورا کرتا ہے، کوسوفٹ ویئر کہتے ہیں۔ (۱)

سوفٹ ویئر کی مختلف قسمیں ہیں:

- مفت سوفٹ ویئر-برامج حرة(Free Software)
- سوفٹ ویئر برائے فروخت(Commercial Softwear)

سوفٹ ویئر کی دو حالتیں:

- ظاہری حالت: سوفٹ ویئر پروگرام کی کی وہ اصلی C.D/D.V.D جس میں وہ فروخت کیا جاتا ہے یا وہ کوڈ جن کے ذریعہ سے وہ تیار کیا جاتا ہے۔
- معنوی حالت: کوئی بھی کمپنی سوفٹ ویئر تیار کرنے کے بعد صرف اس کو استعمال کرنے کا حق فروخت کرتی ہے، اس پر حق ملکیت کمپنی ہی کے پاس رہتی ہے یعنی (Softwear License) کمپنی کسی کو فروخت نہیں کرتی ہے، لہٰذا کسی کے لئے اس کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

الجانب المادي للبرامج، سواء أكان ذلك الجانب هو القالب الذي خزن عليه البرنامج أقراصاً كانت أو غير ذلك، أو كان اللغة التي كتب بها البرنامج. الأمر الثاني: الجانب المعنوي للبرامج، وهو حق البرمجة، ومنتجو البرامج عندما يبيعون للمستخدم البرنامج لا يبيعون له حق البرمجة وإنما يبيعون له حق استخدام البرنامج(Softwear License)، أي أن المستخدم يصبح مخولاً باستخدام البرنامج. (۲)

---

(۱) المعجم الموسوعي لتكنولوجيا المعلومات والإنترنت:۲۸۶، الاعتداء الإلكتروني:۱۹۸

(۲) الاعتداء الإلكتروني:۱۹۹

کسی بھی سوفٹ ویئر کی C.D/D.V.D کی سوفٹ ویئر قیمت کے مقابلے کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے، ڈاکٹر عبدالعزیز بن ابراہیم الشبل نے دوسری قسم میں اس کی معنوی حیثیت کے بارے میں بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

کوئی بھی پروگرام یا سوفٹ ویئر جو اپنی کمپنی کی نمائندگی کرتا ہے، اس کے اوپر اس کی کمپنی کا حق ملکیت ہوتا ہے، کمپنی اس کو بناتی اور اس کے ماہرین کو تنخواہ پر رکھتی ہے اور اس کو تجارت کی غرض سے تیار کرتی ہے، لہٰذا معنوی طور پر وہ پروگرام کمپنی کی ملکیت ہے اس پر کسی بھی قسم کی کوئی زیادتی جائز نہیں ہے۔

مالِ متقوم کی تعریف

فَالْمَال الْمُتَقَوِّمُ عِنْدَهُمْ: هُوَ مَا يُبَاحُ الِانْتِفَاعُ بِهِ شَرْعًا فِي حَالَةِ السَّعَةِ وَالِاخْتِيَارِ.(۱)

ترجمہ: فقہاء کے نزدیک مال متقوم ایسا مال کہلاتا ہے، جس سے حالت اختیاری وکشادگی میں شرعی طور پر نفع حاصل کرنا جائز و درست ہو۔

الْمَال غَيْرُ الْمُتَقَوِّمِ: هُوَ مَا لاَ يُبَاحُ الِانْتِفَاعُ بِهِ فِي حَالَةِ الِاخْتِيَارِ، كَالْخَمْرِ وَالْخِنْزِيرِ بِالنِّسْبَةِ لِلْمُسْلِمِ.(۲)

مال غیر متقوم: جس کا حالت اختیاری میں استعمال کرنا جائز و درست نہ ہو مسلمان کے لئے جیسے شراب خنزیر وغیرہ۔

سوفٹ ویئر کمپنی کی جانب سے برائے فروخت سوفٹ ویئر (Softwear license) پر کسی کا حق ملکیت ظاہر کرنا جرم ہے۔

أن من اعتدىٰ علىٰ مال متقوم ضمنه.(۳)

مال متقوم پر زیادتی کرنے والا اس کا ضامن ہوگا۔

---

(۱) منحۃ الخالق علی البحر الرائق: ۵/ ۲۷۷، تبیین الحقائق: ۵/ ۲۳۵، المبسوط: ۱۳/ ۲۵

(۲) حوالہ سابق

(۳) الموسوعۃ الفقہیہ: ۳۶/ ۳۷

مالکانہ سوفٹ ویئر کو نقصان پہنچانے کے طریقے

☐ وائرس کے ذریعہ سوفٹ ویئر کو تباہ کرنا: اس کو انگریزی میں "Spreading virus and worms" کہا جاتا ہے، ایسا کرنا انٹرنیٹ ہیکروں کا محبوب مشغلہ ہے، ہیکرز ای میل یا چوری شدہ سوفٹ ویئر کے ذریعہ کمپیوٹر میں وائرس پھیلاتے ہیں، اور کمپیوٹر کو نقصان پہنچا کرنا کارہ بنادیتے ہیں، جس کی وجہ سے سافٹ ویئر اپنا کام کرنا بند کردیتا ہے۔ مذکورہ بحث میں سوفٹ ویئر کے مال متقوم ہونے کے بارے میں بحث کی گئی ہے، سوفٹ ویئر کے مال محترم ہونے اور نافعیت کے متضمن ہونے کی بنا پر اس کو نقصان پہنچانا جائز و درست نہیں ہے۔ لہٰذا یہ ایک غیر اخلاقی ناجائز فعل ہے، کسی مسلمان یا ذمی کو نقصان پہنچانا درست نہیں ہے۔

☐ سوفٹ ویئر چوری کرنا: ہیکر یا کسی کمپنی و گروپ کی جانب سے کسی کمپنی کے بنائے ہوئے سوفٹ ویئر کو چوری کرکے اس کو اپنے نام سے فروخت کرنا۔ ایسے سوفٹ ویئر دو قسم کے ہوتے ہیں:

(۱) کمپنی کی جانب سے مفت میں دیے جانے والے پروگرام، جن کو کاپی کرنے کی کمپنی اجازت دیتی ہے اور اس کو خریدنا نہیں پڑتا، بعض اس طرح کے پروگرام وقف علیٰ المسلمین ہوتے ہیں، ان کو ڈاؤن لوڈ کرنے میں اگر انٹرنیٹ کا کچھ خرچہ ہوا تو فروخت کرنے کی گنجائش ہے؛ کیونکہ اس میں کسی کی ملکیت پر زیادتی نہیں ہوتی ہے۔

(۲) کمپنی کی جانب سے تجارتی اغراض کے لئے تیار کئے گئے پروگرام وسوفٹ ویئر، جن کو بلا قیمت کاپی کرنے کی اجازت نہ ہوگی، اس کی مختلف صورتیں ہیں:

● اپنے ذاتی استعمال کے لئے سوفٹ ویئر کو کاپی کرنا اور ڈاؤن لوڈ کرنا، اس کے بارے میں عرب علماء کے مابین اختلاف ہے، **اللجنة الدائمة** (سعودیہ عرب) نے اس فعل کو حرام قرار دیا ہے:

> حرمة هذا الفعل، وممن قال بهذا القول اللجنة الدائمة برئاسة الشيخ ابن باز.[1]

● معاصرین علماء کی ایک جماعت اس کے جواز کی قائل ہے، کیونکہ بعض حکومتیں ذاتی مقاصد کے لئے حق مؤلف کو کاپی کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔

---

(۱) **الاعتداء الإلكتروني**: ۲۰۱

جواز هذا الفعل، و قال به جمع من المعاصرين خاصة و أن بعض الدول تجيز النسخ للاستخدام الشخصي في أنظمتها الخاصة بحقوق المؤلف ولا يستثنىٰ من ذلك البرامج.(١)

● معاصر علماء کی ایک جماعت سوفٹ ویئر کاپی کرنے کے جواز وعدم جواز کے لئے ایک شرط لگاتے ہیں، اگر سوفٹ ویئر کو کاپی کرتے وقت کوئی اس کو کاپی کرنے سے منع کرنے والا ہو یعنی اس کو بلا قیمت ڈاؤن لوڈ کرنے کی اجازت نہ ہو تو ڈاؤن لوڈ کرنا جائز نہ ہوگا۔ شیخ ابن عثیمین کی بھی یہی رائے ہے۔

جواز ذلك إذا لم ينص على ذلك صاحب البرنامج، ولم يكن هناك مايدل على منع ذلك و هو أحد رأي الشيخ ابن عثيمين.(٢)

● آخری قول جس میں معاصر علماء جن میں شیخ عثیمینؒ کی آراء ہیں، اس سے ملتا جلتا **اللجنة الدائمة** کا بھی قول ہے، یعنی کمپنی نے کوئی ایسا سوفٹ ویئر بنایا جس کی قیمت بہت زیادہ متعین کردی جو غبن فاحش تک پہنچ گئی یا ایسا ضروری پروگرام ہے جو نادرالوجود ہے، اور اس کے بارے میں کمپنی تعصب کا برتاؤ کرتی ہے، اور ذخیرہ اندوزی کرکے مارکیٹ میں اپنی قیمت بڑھا رہی ہو جس کی وجہ سے عوام تکلیف میں مبتلاء ہو گئے ہوں، اور ان کا تعلیمی استعمال تعلیمی اغراض کے لئے ہوتا ہو اور حالات اتنے زیادہ سخت ہوں کہ اسلامی الیکٹرانک ثقافت کو اس کے بغیر پھیلانے میں رکاوٹ آرہی ہو تو زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس کو ڈاؤن لوڈ کرنا جائز ہوگا۔

● دوسری صورت: اوریجنل سوفٹ ویئر کی بطور احتیاط کاپی کرنا، یعنی کسی سوفٹ وئیر کو خرید کر اس کی دیگر D.V.D / C.D بنانا، ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سوفٹ ویئر کمپنی کے مالک کو کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ اس کا مقصد خریدار کا اپنے سامان (سوفٹ ویئر) کی حفاظت کرنا ہے۔

● تیسری صورت: کوئی کمپنی یا حکومتی ادارہ یا کوئی غیر حکومتی گروپ ایک اوریجنل سوفٹ ویئر کو خریدے اور اس کو کاپی کرکے اس کا کئی سارے کمپیوٹر میں استعمال کیا جائے اور کمپنی اور خریدار کا اس بات پر معاہدہ ہوا ہو کہ اس کو صرف ایک کمپیوٹر میں استعمال کیا جائیگا، لہٰذا معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا جائز ودرست نہیں ہے اور یہ ایک غیر اخلاقی فعل بھی ہے۔

---

(١) الاعتداء الإلكتروني: ٢٠١ (٢) حوالۂ سابق

ڈاکٹر عبدالعزیز بن ابراہیم الشبل رقمطراز ہیں کہ:

هذه الحال لا تجوز إلا إذا كان هناك اتفاق بين المنشأة و بين صاحب البرنامج على جواز ذلك فإن كان السماح محدد بنسخ معينة، فإنه لا يجوز تعدي تلك النسخ.[١]

● چوتھی صورت: کسی ایک سوفٹ ویئر کو خرید کر اس کی کاپی تیار کرنا اور بیچنا جائز نہیں کیونکہ کسی کے مال محترم پر زیادتی کرنا جائز نہیں ہے۔

نسخ عدة نسخ من أجل المتاجرة بها، وهذه الحال لاتجوز وذلك للأدلة العامة على حرمة الاموال المحترمة.[٢]

● پانچویں صورت: کمپنی میں کام کرنے والے ملازمین کمپنی کے بنائے ہوئے سوفٹ ویئر اور پروگرام کو کمپنی کے حساب کے علاوہ کاپی کریں ایسا کرنا جائز نہیں کیونکہ اس کا شمار خیانت میں ہوگا اور اللہ نے خیانت کرنے والوں پر لعنت کی ہے، یا ویب سائٹ کی نگرانی کرنے والا کسی کو مفت میں سوفٹ ویئر ڈاؤن لوڈ کرنے دے ایسا کرنا شرعی واخلاقی طور پر جائز نہیں ہے۔

● چھٹی صورت: کسی بھی پروگرام کو کسی کار خیر یا تعلیمی اغراض کے لئے ڈاؤن لوڈ کرنا درست ہے، جبکہ اس میں کسی کے مال محترم پر زیادتی نہ ہوتی ہو۔ ایک اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ آج کل کمپنیاں ہمیشہ اپنے معنوی حقوق کی حفاظت کی بات کرتی ہیں، اور معاشرہ کی ترقی کے لئے اس کی اہمیت کا ذکر کرتی ہیں، لیکن جب معاملہ ان کا اپنا ہوتا ہے تو اس کا خیال نہیں رکھتی، کمپنیاں آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال نہیں کرتی ہیں ان کو پامال کرتی ہیں۔ جیسے بہت سی کمپنیاں علمی ادبی کتابوں کو جمع کرکے الیکٹرانک کتابوں کی لائبریری بناتی ہیں اور اس میں شرعی کتب بھی داخل ہوتی ہیں، لیکن بے حد افسوس ناک بات یہ ہے کہ کمپنی کسی مصنف یا مؤلف ومحقق یا ناشر سے کتابوں کو ڈیجیٹل کرنے کی اجازت نہیں لیتی ہیں، جس کی وجہ سے ان حضرات کو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے اور وہ رائلٹی سے محروم ہوجاتے ہیں۔

بعض کمپنیاں اپنے خریدار کے حقوق کی پاسداری نہیں کرتی ہیں، جب یہ بات مسلمہ ہے کہ بغیر

---

(١) الاعتداء الإلكتروني: ٢٠٢ (٢) حوالۂ سابق ٢٠٣

اجازت سوفٹ ویئر کو کاپی کرنا حرام ہے کمپنی کی معنوی وحقیقی ملکیت ہونے کی وجہ سے،لیکن اگر کوئی شخص کمپنی سے کوئی پروگرام دس ہزار روپے کا خریدتا ہے،اور کمپنی کو اس کو تیار کرنے میں ایک لاکھ کی لاگت لگی ہے،لہٰذا کمپنی کا حق معنوی اس پروگرام پر نوّے لاکھ ہے؛لیکن کسی وجہ سے خریدار کے پاس سے وہ سوفٹ ویئر خراب ہوجاتا ہے،اب وہ کمپنی سے نیا نسخہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو کمپنی اس سے پوری رقم مانگتی ہے جب کہ دیانت کا تقاضہ یہ ہے کہ کمپنی خریدار کو دوبارہ دس ہزار کے بدلے نسخہ نہ دے بلکہ بلکہ وہ نصف یا ثلث قیمت کے بدلے دوبارہ نسخہ جاری کردے،لیکن کمپنیاں عام طور پر اس کی خلاف ورزی کرتی ہیں۔

□ انٹرنیٹ سے معلومات،ڈاٹا اور دستاویزات کی چوری:

ڈیجیٹل ماحول میں ڈاٹا چوری ہونا عام ہوگیا ہے،کسی کی معلومات ودستاویزات اڑانا کسی کے کمپیوٹر میں سینده لگانا آسان ہے،اس کے لئے صرف انٹرنیٹ کنکشن کی ضرورت ہے،آسانی کے ساتھ بند کمرے میں بیٹھ کر دوسرے کمپیوٹر پر حملہ کرکے اس میں سے ڈاٹا دیکھ سکتے ہیں اس کو کاپی کرسکتے ہیں چرا سکتے ہیں،ڈیجیٹل ماحول میں ڈاٹا کی قیمت سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے،کمپنی ادارہ اکیڈمی سب کمپیوٹر پر بھروسہ کرکے آرام سے بیٹھ گئے ہیں،اگر کمپیوٹر سے معلومات چوری ہوتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کمپنی ختم،ادارہ لاچار،اکیڈمی بند۔

ڈاٹا چوری کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کی متعدد صورتیں ہیں:

● معلومات یعنی ڈاٹا کو چرانا یا اس سے مادی یا ادبی نفع اٹھانا۔ ● محفوظ ڈاٹا میں تحریف یعنی رد وبدل کردینا۔ ● دستاویزات میں پھیر بدل کرنا۔

سیریا کے مشہور ریسرچ اسکالر مصطفی عباس لکھتے ہیں:

> بے شک ہم سب جانتے ہیں کہ چوری چوری ہے،اور چور چور ہے،چاہے چوری ہونے والی چیز مال ہو یا فکر یا کوئی دوسری چیز،بلکہ فکر کا چوری ہونا مال کے چوری ہونے سے زیادہ خطرناک ہے،کیونکہ مال کو حاصل کرنا آسان ہے۔[1]

لیکن کسی انوکھی تحقیق کے لئے علم کے بحر ناپیدا کنار میں غوطہ لگا کر قیمتی جواہرات تلاشنا،کسی اہم موضوع کا حق ادا کرنا،فکر دردمند کا حامل ہونا،دلآویز جذبات واحساسات سے لبریز ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں،اس کے لئے سخت محنت وجفاکشی درکار ہوتی ہے پھر جاکر کہیں گلشن علم وادب میں نور ونکہت کا ظہور ہوتا ہے۔

---

(۱) لصوص الانترنت من یحاسبهم:۳۹

حکم شرعی:

اگر کسی نے مصحف چوری کیا، یا کوئی حدیث یا عربی یا اشعار کی کتاب کو چوری کیا تو اس کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر وہ چیزیں دس درہم کے بقدر ہیں تو ہاتھ کاٹے جائیں گے؛ کیونکہ لوگ اس کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور اس کو عمدہ مال شمار کرتے ہیں۔ (١)

❑ **ویب سائٹ کو نقصان پہنچانا:** کسی کمپنی یا ادارہ کی ویب سائٹ کو ہیک کرنا اور اس کو ناکارہ بنانا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس کا شمار موجودہ دور کے الیکٹرانک سرمایہ میں ہوتا ہے، اور کسی کے مال محترم پر زیادتی کرنا جائز نہیں ہے، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

﴿وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾ (٢)

اللہ کی راہ میں قتال کرو ان سے جو تم سے قتال کرتے ہیں، اور کسی پر زیادتی مت کرو بے شک اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ہے۔

حدیث نبوی ہے کہ:

حضرت ابو ہریرةؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آپس میں حسد نہ کرو، ایک دوسرے کے لئے دھوکہ سے قیمت نہ بڑھاؤ، ایک دوسرے پر غصہ نہ کرو، ایک دوسر کے پیچھے مت پڑو، ایک دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرو، اللہ کے بندو! بھائی بھائی ہو جاؤ، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر نہ ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو شرمندہ کرتا ہے، نہ اس کو حقیر سمجھتا ہے، اور تقویٰ یہاں ہے- آپ اپنے سینے کی طرف کو اشارہ کرر ہے تھے- اور آدمی کے برا ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو حقیر جانے، مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت حرام ہے۔ (٣)

---

(١) بدائع الصنائع: ٧/ ٦٧ (٢) البقرة: ١٩٠

(٣) صحیح مسلم، باب تحریم ظلم المسلم وخذله، رقم الحدیث: ٢٥٦٤

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوم النحر میں اعلان کیا تھا:

فان دماءکم وأموالكم وأعراضكم بينكم حرام، كحرمة يومكم هذا، في شهركم هذا، في بلدكم هذا.(۱)

بے شک تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت آپس میں ایک دوسرے پر حرام ہے آج کے دن کی حرمت کی طرح اس محترم شہر اور مہینے میں۔

اگر کسی ایسی ویب سائٹ پر حملہ کیا ہو جس کا شمار مال محترم میں نہ ہوتا ہو، جیسے جنگ کے حالات میں یا وہ ویب سائٹ جو غیر اخلاقی، اخلاق سوز ہوں، تو ان کو ہیک کرنا اور نقصان پہنچانا باعث اجر وثواب ہوگا، اور اگر صلاحیت کے باوجود منکر پر نکیر نہیں کی یعنی ان کے خلاف اپنی وسعت کے بقدر کوشش نہیں کی تو گناہ گار ہوگا۔
سعودی عرب کے مفتی آل الشیخ سے سوال کیا گیا کہ انٹرنیٹ پر ایسی ویب سائٹ جو اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی ہیں اور غیر اخلاقی چیزوں کو فروغ دے رہی ہیں تو کیا ان کو نقصان پہنچانا ان پر وائرس پھیلانا جائز ہوگا؟
شیخ نے جو کچھ جواب میں لکھا، اس کا خلاصہ یہ ہے:

بے شک اخلاق سوز، بے حیائی لادینیت ومغربیت کو فروغ دینے والی ویب سائٹ کو ہیک کر کے اس کو نقصان پہنچانا۔ اس کو ناکارہ بنانا ایک عظیم منکر کا ازالہ ہے، لیکن ایسی ویب سائٹ کو ہیک کرنے اور کو دیگر بعض علماء غیر ضروری سمجھتے ہیں؛ کیونکہ مسلمانوں کی ویب سائٹ انتقاماً ہیک کیا جاتا ہے۔ جس کے بدلہ بڑا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، ان حضرات نے قرآن کریم کی آیت: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ سے استدلال کیا ہے، لیکن اگر ان کی جانب سے زیادتی کی جائے ویب سائٹ کو نقصان پہنچایا جائے تو ان کا جواب دینا مشروع ہوگا۔(۲)

مفتی آل الشیخ کا فتویٰ مصلح مرسلہ کی رعایت کرتے ہوئے ویب سائٹ ہیک کرنے یا نقصان پہنچنے کی وجہ سے مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے، مسلم ویب سائٹ کو انتقاماً بہت زیادہ نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے، جن کے ذریعہ سے اصلاح معاشرہ اور نئی نسل کی نفع رسانی کا کام ہو رہا ہے۔

(۱) صحیح بخاری، باب حجۃ الوداع، رقم الحدیث: ۴۴۰۶

(۲) جريدة الرياض، العدد: 12051، يوم الجمعة 1/ ربيع الأول 1420

❑ ویب سائٹ ہیکنگ کا حکم

ویب سائٹ ہیک کرنا حرام قرار دیا جائے ،تو ہیک کرنے والے کے ذمہ ویب سائٹ کو پہنچایا گیا نقصان لازم ہوگا۔لیکن کچھ ویب سائٹ محرمات کے فروغ اور منکرات کی تشہیر کے لئے بنائی جاتی ہیں ایسی ویب سائٹ کو ہیک کرنے پر ہیکر پر ضمان نہیں ہوگا کیونکہ یہ مال محترم نہیں۔

❑ ویب سائٹ کو بلاک کرنا

بے حیائی و برائی کو فروغ دینے والی ویب سائٹ کو بند کرنا ان کو بلاک کرنا بہت زیادہ مفید اور ثواب کا کام ہے،اس کے ذریعہ سے برائی کا خاتمہ و منکر کا ازالہ ہوگا اور آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

> تم میں سے جو برائی کو دیکھے اس کو چاہئے کہ وہ اس کو اپنے ہاتھ دور کردے،اگر وہ اس چیز پر قادر نہ ہوسکے تو اس کو اپنی زبان سے برا کہے اگر اس پر قادر نہ ہوسکے اس دل میں برا سمجھے یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے۔(۱)

لہٰذا جو انٹرنیٹ ویب سائٹ میں مہارت رکھتے ہیں، ان کے لئے منکر کا ازالہ ہاتھ سے ہونا چاہئے ، یعنی وہ اپنی دست کاری کا ہنر دکھائے اور احتیاط و دانشمندی کے ساتھ اس کو بلاک کرے ،اگر وہ ماہر نہیں ہے تو ایسی ویب سائٹ کو دل میں برا جانے اور اس کو استعمال کرکے مارکیٹ میں اس کے ریٹ نہ بڑھائے۔لیکن بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایسی ویب سائٹ بلاک کردی جاتی ہیں جو صحیح اور تجارتی اغراض کے لئے بنائی جاتی ہیں اور کسی کا دھیان برائی کے خاتمہ کی جانب نہیں ہوتا۔اگر کسی ویب سائٹ پر غلط مواد موجود نہیں ہے،اس کو بلاک کرنے والے پر اس کا ضمان عائد ہوگا ، مال محترم پر تعدی کرنے کی وجہ سے،اور اس کا مالک نقصان پہنچانے والے کے خلاف مقدمہ دائر کرسکتا ہے اور نقصان کی تلافی کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔

❑ ڈومین ایڈریس کی چوری

تجارتی وتحریکی اغراض کے لئے بنائی جانے والی ویب بڑھتی ہوئی تعداد اور اس کے بے پناہ فوائد کے ساتھ ساتھ سائبر جرائم بھی بڑھ رہے ہیں ،یعنی ویب سائٹ کے ڈومین ایڈریس کی چوری ہونے لگی ہے، کسی معروف ومشہور ادارہ یا کمپنی کی ویب سائٹ سے ملتا جلتا نام رکھ کر لوگ جعل سازی کررہے ہیں ، جیسے دعوتی مشہور رسالہ ارمغان ولی اللہ کی ویب سائٹ www.armughan.in ہے،جس پر ملکی وغیر ملکی سیکڑوں قارئین

(۱) صحیح مسلم ،بَابُ بَيَانِ كَوْنِ النَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ مِنَ الْإِيمَانِ، رقم الحدیث:۴۹، سنن ابن ماجہ: ۴۰۱۳،مسند احمد طیالسی: ۱۱۴۶۰

روزانہ ارمغان پڑھتے ہیں، دفتر ارمغان اپنی ویب سائٹ پر کسی طرح کے اشتہار نہیں جاری کرتا ہے، کسی مرد نامعقول نے اس کے ملتے جلتے ڈومین نام سے ویب سائٹ تیار کی اور اس کا نام www.armughan.com یا www.armugan.in رکھا، اور اس کا لنک پھیلانا شروع کر دیا، بڑی تعداد میں ای میل بھی کر دئے، اس طرح اس پر تجارتی اشتہارات بھی ڈال دیے، جس کی وجہ سے اس کو فائدہ ہونے لگا، visitor نہ آنے کی وجہ سے تحریک ارمغان کو نقصان ہوگا، معاصر علماء ویب سائٹ کے نام کو مال متقوم مانتے ہیں اور مال متقوم پر زیادتی جائز نہیں ہے، چنانچہ ڈاکٹر عبدالعزیز بن ابراہیم الشبل لکھتے ہیں کہ:

اسم المواقع مال متقوم لا يجوز الاعتداء عليه ولا سرقته.(١)

□ ای میل پر حملہ

سائبر جرائم کی دنیا میں بہت سے جرم کسی جماعت یا ادراہ کو نقصان پہنچانے کے لئے ہوتے ہیں، لیکن کسی فرد واحد کی ذات کو نقصان پہنچانے اور اس کی جاسوسی کرنے کے لئے اس میدان میں inbox کی جاسوسی کی جاتی ہے اور اس کی بہت سی قسمیں جن میں زیادہ رائج کا ذکر کیا جا رہا ہے:

inbox / Cyber Stalking کی جاسوسی کرنا: لوگوں کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کے لئے اسپیم بوٹس (spam bots) ای میل میں سیندھ مارتے ہیں یا اس کی جاسوسی کرتے ہیں، یا انٹرنیٹ پر ہونے والی چیٹنگ کی جاسوسی کرتے ہیں، کسی کے ذاتی کمپیوٹر میں ای میل کے ذریعہ گھس کر اس کے خلاف اسکینڈل بناتے ہیں اس کا ناجائز استحصال کرتے ہیں وغیرہ۔

جاسوسی کا شرعی حکم

جاسوسی کے ذریعہ سے کسی کی ذاتیات وشخصیات کو نقصان پہنچتا ہے، اسلام نے کسی کی جاسوسی کرنے کو غلط کہا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت قرآن میں فرماتے ہیں:

اے ایمان والو! کسی کے بارے میں ظن سے بچو بے شک بعض ظن گناہ ہیں، اور کسی جاسوسی مت کرو اور کسی کی کسی سے غیبت مت کرو کیا تم میں سے کوئی اس

---

(١) الاعتداء الإلكتروني:٢٠٨

بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے پس تم اس کو ناپسند
کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ توبہ کو قبول کرنے والا رحیم ہے۔ (۱)

استثنائی صورتیں

کسی جابر وظالم حکومت کے خلاف یا مجرمین کی سرکوبی کرنے کے لئے بدامنی وخوف ودہشت سے حفاظت کے لئے ولی الامر کو جاسوسی کی اجازت ہوگی، لیکن اگر جاسوسی بغیر کسی شرعی سبب کے کی جائے تو جاسوس گناہگار ہوگا اور اللہ کے حکموں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوگا، حدیث نبوی ہے کہ:

حضرت ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا بد گمانی سے بچو بے شک بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے اور کسی کے احوال کو جاننے کے لئے پیچھے مت پڑو، اور کسی کی جاسوسی مت کرو، اور کسی سے حسد نہ کرو، اور کسی کی پیٹھ پیچھے برائیاں نہ کرو، اور کسی کے ساتھ غصہ مت کرو، اور اللہ کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ۔ (۲)

فقہاء کی آراء

اس تعلق سے فقہاء کی آراء کو موسوعۃ فقہیہ میں اختصار کے ساتھ جامع انداز میں ذکر کیا گیا ہے:

مسلمان کی جاسوسی کرنا اللہ رب العزت کے فرمان ''ولا تجسسوا'' کی وجہ سے حرام ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے مسلمان کے راز فاش ہوتے ہیں جن کو اللہ رب العزت نے چھپا رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: اے وہ لوگوں جو ایمان لائے زبان سے اور ایمان ان کے دلوں تک نہیں پہنچا ہے، وہ کسی کے راز کے پیچھے نہ پڑیں، اگر وہ مسلمانوں کے راز و پوشیدگی کے پیچھے پڑیں گے تو اللہ ان کے راز کے پیچھے پڑ جائے گا اور اس کو فاش کردے گا چاہے وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر ہی کریں۔

---

(۱) الحجرات: ۱۲

(۲) صحیح بخاری، باب ماینھی عن التحاسد: ۱۵۴۳، صحیح مسلم، باب تحریم الظن: ۲۵۶۳

علامہ ابن وہبؒ فرماتے ہیں کہ: جاسوسی کرنا جائزنہیں ہے، مگر امام، والی، زنا کے چار گواہوں میں سے کسی ایک کے لئے، جاسوسی کرنے کے وجوب کے بارے میں ابن ماجشون سے نقل کیا گیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ: چور، ڈاکو، کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ان کی مکمل طور پر نگہبانی کی جائے اوران کے ارادوں سے باخبر رہنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ ان کو قتل کردیا جائے یا یہ زمین کو بغاوت سے پاک کردیں، اوران کے کے بارے میں معلومات ان کی جاسوسی کے ذریعہ حاصل ہوگی۔

مسلمان اورغیر مسلم کے درمیان جنگ میں جاسوس بھیجنا دشمن کی فوجی دستہ وقوت وزورکا اندازہ لگانے کے لئے جائز ہے۔(۱)

بچوں کی جاسوسی

موجودہ سائنس اورٹیکنالوجی کے زمانے میں نئی نسل جلدی بالغ ہونے لگی ہے، انٹرنیٹ پر غیراخلاق وفحش مواد کی کثرت ہے، ایسے میں والدین کو آزادی کے ساتھ اپنے بچوں کو انٹرنیٹ استعمال کرنے کی اجازت دینا بہت نقصاندہ ثابت ہورہی ہے جس کی وجہ سے ان کے معصوم ذہن ودماغ پر غلط اثرات پیدا ہورہے ہیں اوران کو دینی ونفسیاتی طور پر اغواء کیا جارہاہے، ان سے بچانے کے لئے والدین کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کے کمپیوٹر اوران کے (Browser Archive) کی جاسوسی کریں، اوران کو غلط استعمال کے مضر اثرات اور دینی نقصان کے بارے میں بتائیں اوران کے دل میں ہر وقت اللہ دیکھ رہاہے کا خوف رچا بسا دیں، اگر والدین بچوں کے کمپیوٹر پروگرام کی جاسوسی کریں گے تو وہ برائیوں میں مبتلاء ہونے سے بچیں گے۔

جاسوس کی سزا

سائبر جرائم کی دنیا میں جاسوسی کرنا مجرمین کا محبوب مشغلہ ہوگیا ہے، کسی کے لئے بغیر کسی شرعی سبب کے جاسوسی کرنا جائزنہیں ہے، جاسوس کے بارے میں شریعت اسلامی میں سخت ترین سزائیں ہیں تاکہ معاشرہ سے گندگی دورہو اور پاک صاف معاشرہ کا قیام ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) الموسوعۃ الفقہیہ: ۱۰/ ۱۶۲

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ: أَنَّ رَجُلًا اطَّلَعَ مِنْ بَعْضِ حُجَرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، "فَقَامَ إِلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمِشْقَصٍ، أَوْ: بِمَشَاقِصَ، فَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ يَخْتِلُ الرَّجُلَ لِيَطْعُنَهُ". (۱)

حضرت انس بن مالک ؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص جھانکنے لگا آپ ﷺ کی ازواج کے کسی حجرہ میں، آپ ﷺ تیر کا پھل یا کئی سارے تیروں کے پھل لے کر اس کی طرف بڑھے، حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اس طرح ان کی جانب بڑھ رہے تھے کہ اس کو احساس بھی نہیں ہو پائے اور آپ اس کو مار دیں۔

حدیث کی مختلف روایات کے تتبع سے پوری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک اعرابی جسے شہری زندگی کا سلیقہ نہیں تھا اور آدابِ اذن سے ناواقف تھا، وہ آکر آپ ﷺ کی ازواج میں سے کسی کے حجرہ میں جھانکنے لگا، آپ ﷺ کو اس کا احساس ہوا تو آپ ؐ تیر کا پھل لیکر آہستگی سے اس کی جانب بڑھے، وہ دیہاتی آپ ؐ کی آمد کا احساس کر کے سوراخ سے جھانکنا چھوڑ کر ہٹ گیا، آپ ؐ نے فرمایا اگر تم سوراخ سے اپنی نظریں جمائے رکھتے تو میں تمہاری آنکھ پھوڑ دیتا۔ (۲)

فقہاء کی آراء

جاسوس جو اسلامی مملکت کے راز دشمنوں تک پہونچاتا ہے، اگر وہ ''حربی'' یعنی ایسے ملک کا باشندہ ہو جس سے مسلم مملکت کا معاہدہ امن نہ ہو، تو اتفاق ہے کہ اس کو قتل کر دیا جائیگا، اگر معاہد یا ذمی ہو تو جاسوسی کی وجہ سے اس سے ''عہد'' ٹوٹ جائے گا، یہ امام مالک ؒ کی رائے ہے اور حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت سلمہ ابن اکوع ؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ سفر میں تھے، ایک جاسوس آیا اور بعض صحابہ ؓ کے ساتھ گفتگو کرتا ہوا بیٹھا اور کھسک گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو قتل کر دو، چنانچہ میں نے سبقت کی اور اس کو قتل کر دیا۔

---

(۱) صحیح البخاری، باب الاستئذان من أجل البصر: ۶۲۴۲، نیز صحیح مسلم: ۲۱۵۷

(۲) بحوالہ ترمذی ونسائی

مسلمان جاسوس کی سزا: کوئی مسلمان شخص جاسوسی کرے تو مالکیہ اور حنابلہ اس کو قتل کی اجازت دیتے ہیں، احناف اور شوافع کے نزدیک ایسا شخص قتل کا مستحق نہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ تعزیر کا ہے اور تعزیر قاضی ووالی کی صواب دید پر منحصر ہے، فقہائے احناف نے بعض صورتوں میں مصلحتاً قتل تک کی اجازت دی ہے۔[۱]

لہٰذا اگر کوئی مسلمان شخص کسی مسلمان کی انٹرنیٹ پر جاسوس کرے یا اس کے خفیہ راز کو جاننے کی تگ ودو میں پکڑا جائے تو اس پر قاضی شریعت سزا تجویز کریں گے، نیز اگر کوئی غیر مسلم مسلمان حکومت یا کسی مسلمان کی جاسوسی کرے تو اس کو جاسوسی کے جرم میں حاکم قتل کردے گا۔

(Spoofing) اشتہاری میلس یا اسپیم میل:

انٹرنیٹ کے ذریعہ اشتہار کے طور پر بھیجے جانے والے تقریباً ۳۰ ملین الیکٹرانک میلس (ای میل) میں سے پچاس فیصد یومیہ spam میلس ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی یہ تعداد ۹۰ فیصد یومیہ تک پہنچ جاتی ہے۔

❑ Spam کیا ہے؟: ای میل کرتے وقت تجارتی اغراض و مقاصد کے لئے مالویر/ Malwear اس میں اشتہار داخل کردیتا ہے اور ای میل کو بھیجتے وقت وہ اشتہار مرسل الیہ کے پاس پہنچ جاتا ہے، جیسے ہی وہ اس کو دیکھتا ہے scan کرتا ہے ای میل اس کو جانچ لیتا ہے کہ درمیان میں کسی نے اشتہار داخل کیا ہے، وہ اس کو inbox میں میں محفوظ نہیں کرتا ہے بلکہ اس کو SPAM میں بھیج دیتا ہے، ظاہر ہے درمیان میں کسی کے خط کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا خود ایک غلط کام ہے اور خیانت کا ارتکاب ہے، دوسری جانب مرسل الیہ اس طرح کے میلس کو پسند نہیں کرتا؛ کیونکہ اس طرح کے میلس میں عام طور پر وائرس ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے اس کے کمپیوٹر میں وائرس پھیلنے کا اندیشہ رہتا ہے اور فضول وواہیات چیزیں اسپیم میل میں بھیجی جاتی ہیں۔

اشتہاری میلس کو فری میلس میں بلاک کرنا

مفت میں اشتہاری میلس سے مستفید ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے، Gmail / YAHOO / Hootmail اپنے صارفین کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے مفت اشتہار کے طور پر ای میل بھیجتی ہے اور اپنے اشتہار کو فروغ دیتے ہیں۔ اور وہ اپنے یوزر کے ساتھ معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ کمپنی کے بنیادی قوانین کی پابندی کرے گا، لہٰذا ایفائے عہد کے طور پر اس کو پورا کرنا ضروری ہے، اور خدمات فراہم کرنے والی کمپنی کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔

---

(۱) قاموس الفقہ: ۳/ ۲۷-۳۷

کمپیوٹر انٹرنیٹ کے ذریعہ مالی نقب زنی (Money Laundring)

سائبر جرائم کی دنیا میں سب سے زیادہ واقعات مالی نقب زنی سے متعلق ہوتے ہیں، اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے اس کے متعلقہ مسائل پر بحث کرتے ہیں:

❑ چور اور خائن میں فرق

● سرقہ (چوری) کے لغوی معنی کسی چیز کو چھپا کر یا حیلہ بازی کے ذریعہ لینے کے ہیں، أخذ الشئ في خفاء و حيلة[1]، سرقہ کی اصطلاحی تعریف دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر فقہاء نے کی ہے اور دونوں میں کسی قدر فرق ہے ایک تعریف اس پہلو کو سامنے رکھ کر ہے کہ یہ فعل حرام ہے، اس حیثیت سے سرقہ کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

> هو أخذ الشئ من الغير على وجه الخفية بغير حق سواء كان نصابا ام لا .[2]
>
> دوسرے کا مال چھپا کر ناحق طریقہ سے لینا چاہے نصاب سرقہ کی مقدار ہو یا نہیں۔

دوسری تعریف اس کی متعینہ شرعی سزا کے جاری ہونے کے بارے میں اس کی تعریف یہ کی ہے:

> سرقہ مکلف گویائی پر قادر اور بینا شخص کا دس درہم یا اس کی مقدار لے لینا ہے، جس کو بالا رادہ لیا گیا ہو اور مقام محفوظ سے کھلے طور پر باہر لے جایا گیا ہو، چیز چھپا کر لی گئی ہو، جس شخص سے لی گئی ہو وہ اس پر جائز قبضہ رکھتا ہو، ایسی چیز ہو جو جلدی خراب نہیں ہوتی، دارالسلام میں یہ سامان لیا گیا ہو، وہ محفوظ رہا ہو اور لینے والے کے لئے اس مال میں نہ ملکیت کا شبہ ہو اور نہ تاویل کی گنجائش۔[3]

خائن ایسے شخص کو کہا جائے گا جو کسی معاہدہ کی چھپ کر خلاف ورزی کرے، مذکورہ آیت میں اللہ تعالی حکم دے رہے ہیں اگر دوسری جانب سے عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو ان سے کھلے طور پر اعلان کیا جائے کہ ہم اب معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے، مگر یہ اعلان اس طور پر ہو کہ مسلمان اور دوسرا فریق اس میں

---

(۱) البحر الرائق: ۵/۴۹

(۲) حوالۂ سابق: ۵/۵۰

(۳) درمختار: ۳/۱۹۲-۱۹۳

برابر ہوں، یعنی اعلان اس طور پر نہ ہو کہ اعلان سے پہلے مقابلے کی تیاری کر لی جائے اور دوسری جانب خالی الذہن ہونے کی بناء پر تیاری نہ کر سکیں بلکہ جو کچھ تیاری کرنی ہو وہ اس اعلان اور تنبیہ کے بعد کریں۔

یہ ہے اسلام کا عدل وانصاف کہ خیانت کرنے والے دشمنوں کے بھی حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے اور مسلمانوں کو ان کے مقابلہ کا پابند کیا جاتا ہے کہ عہد کو واپس کرنے سے پیشتر کوئی تیاری بھی نہ کریں۔

فقہاء کرام نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے:

من يأخذ المال خفية ويظهر النصح للمالك.[1]

ایسا شخص جو چپکے سے مال کو لے اور مالک کے سامنے امانت داری کا اظہار کرے۔

علامہ ابن ہمام کے نزدیک خائن کی تعریف یہ ہے:

کسی کو عاریت یا ودیعت کے طور پر امین بنایا جائے، امین بن جانے کے بعد اس پر قبضہ کر لے اور اس ضائع ہونے کا دعوی کرے یا عاریت اور ودیعت کا انکار کرے۔[2]

● خائن اور سارق میں فرق:

علماء نے خائن سارق اور غاصب کے درمیان میں فرق کیا ہے، خائن امانت میں خیانت کرنے والے شخص کو کہتے ہیں، سارق (چور) کسی کا مال چھپا کر محفوظ مقام جہاں تک اس کو جانے کی اجازت نہ ہو سے لینے والے کو کہتے ہیں، بلاشبہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر چور خائن ہوسکتا ہے اور ہر خائن چور نہیں ہوسکتا، غاصب کھلم کھلا اپنی قوت بازو کے زور پر لوٹ مار کرنے والے کو کہا جاتا ہے۔[3]

خائن کسی تجوری یعنی محفوظ مقام سے مال نہیں لیتا؛ بلکہ اپنے پاس موجوف امانت میں خیانت کرتا ہے، برعکس چور محفوظ و مامون جگہ سے مال حاصل کرتا ہے۔

---

(۱) تحفۃ الاحوذی: ۵/ ۷

(۲) فتح القدیر: ۵/ ۳۷۳

(۳) الموسوعۃ الفقہیہ: ۲۰/ ۱۸۵

□ مختلس (لٹیرے) اور چور میں فرق

● **مختلس کی لغوی تعریف:**

مختلس ایسے شخص کو کہا جاتا ہے، جو دھوکہ دے کر کسی کی چیز لوٹ لے، اغواء کرلے، یا غبن کرلے وغیرہ۔لسان العرب میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے:

خلس فی اللغة: أخذ الشئی مُخادعةً عن غفلة.(۱)

جبکہ اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

أَخْذُ الشَّيْءِ بِحَضْرَةِ صَاحِبِهِ جَهْرًا مَعَ الْهَرَبِ بِهِ سَوَاءٌ جَاءَ الْمُخْتَلِسُ جِهَارًا أَوْ سِرًّا، مِثْل أَنْ يَمُدَّ يَدَهُ إِلَى مِنْدِيل إِنْسَانٍ فَيَأْخُذَه.(۲)

مالک کی موجودگی میں کھلے عام کسی کی چیز کو چھیننا چاہے، مختلس کھلم کھلا آئے یا چھپ کر، جیسے کسی شخص نے کسی کے رومال کی جانب اس کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور اس کو اٹھالیا۔

□ چور اور لٹیرے میں فرق

● چور چوری چپکے سے اور محفوظ مقام سے کرتا ہے، برعکس مختلس (لٹیرا) اپنے فعل میں اعلانیہ اور چپکے دونوں طرح سے لوٹتا ہے اور اس کو غبن کرتا ہے اغواء کرتا ہے۔

● چور چوری محفوظ مقام سے کرتا ہے مگر مختلس محفوظ وغیر محفوظ دونوں مقام پر اپنی سیندھ لگاتا ہے۔

□ سارق اور منتہب میں فرق یہ ہے: منتہب یعنی ڈاکو مال کو کھلے عام اپنی قوت وزور کی بنیاد پر لیتا ہے، جبکہ چور چپکے سے محفوظ مقام سے حاصل کرتا ہے۔

انٹرنیٹ پر ہونے والی مالی نقب زنی کا طریقہ (Way Of Money Laundring)

سائبر مالی نقب زنی کی دو قسمیں ہوسکتی ہیں:

بینک اکاؤنٹ سے رقم چوری کرنا۔

کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ رقم چوری کرنا۔

---

(۱) لسان العرب/ والمصباح (۲) الموسوعۃ الفقہیہ: ۲/ ۲۸۸، نیز فتح القدیر: ۵/ ۳۷۳

□ پہلی قسم: بینک اکاؤنٹ کے ذریعہ رقم چوری کرنا

سائبر جرائم کی دنیا میں معمولی محنت ومشقّت کے بغیر مال حاصل کرنا اصل مقصد ہوتا ہے، اس جستجو میں مجرمین لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح مال حاصل ہوجائے چاہے کسی کا دیوالیہ نکل جائے، انٹرنیٹ کے ذریعہ انگلیوں سے مال کمانے کے لئے روزانہ نئے نئے طریقہ ایجا ہورہے ہیں اوران سب کے سامنے بینک کے ذمہ داران اورحکومت کوئی مضبوط اورٹھوس قانون نہیں بناپائی ہے، چند مشہور طریقوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

● کرنٹ اکاؤنٹ میں ہیرا پھیری

ایک اکاؤنٹ سے دوسرے اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر کرنا، بینک ویب سائٹ کو ہیک کرکے اس کے خفیہ پاسورڈ جان لینے کے بعد اس میں سے رقم چوری کی جاتی ہے، خفیہ پاسورڈ جاننے کے لئے سافٹ ویئر ماہرین صارفین کے فون نمبر یا ان کے ای میل یا بینک کی ویب سائٹ کے کمزور علاقوں پر حملہ کرکے حاصل کرتے ہیں، انٹرنیٹ کے ذریعہ بینک پر کی جانے چوری ہونے والی رقومات بہت کم لوٹائی جاتی ہیں، اس لئے کہ تمام مالیاتی ادارہ چوری کو چھپاتے ہیں عوام کے بینک پر اعتماد وبھروسہ کو برقرار رکھنے کے لئے اوردوسرے نئے ہیکر کو ویب سائٹ ہیک کرنے کا راستہ نہ دکھانے کے لئے، سعودی عرب کے مشہور ریسرچ اسکالر معروف عالم دین جامعہ امام محمد بن سعود کے استاد فقہ ڈاکٹر عبدالعزیز بن ابراہیم الشبل رقمطراز ہیں کہ:

> و بعض الدراسات تشير الى أن ٢٪ فقط من الاعتداءات يتم الإبلاغ عنها.[۱]
>
> تحقیق کے مطابق ۲ فیصد ہونے مالی زیادتیوں کے بارے میں کوئی کاروائی ہوتی ہے۔

□ دوسری قسم: بینک سے جاری ہونے والے کارڈ اورسائبر جرائم

ATM CARD - CREDIT CARD

ATM CARD کے ذریعہ سائبر جرائم:

اے ٹی ایم کارڈ کے انٹرنیٹ پر خریداری کی صورت میں اگر ہیکر کو اس کے پاس ورڈ تک رسائی ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے آن لائن خریداری کرکے نقصان پہنچا سکتے ہیں، لہٰذا انٹرنیٹ پر اے ٹی ایم کارڈ کا زیادہ استعمال مضر ہے جس کے بہت سے خطرناک نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

---

(۱) الاعتداء الإلكتروني

CREADIT CARD کے ذریعہ سائبر جرائم:

کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سائبر جرائم کا اہم طریقہ صارف کے کارڈ کا پاسورڈ جان لینے کے بعد اس کے ذریعہ سے خریداری کرنا، اور کارڈ کے مالک کو نقصان پہنچانا ہے، لیکن پاسورڈ حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کئے جاتے ہیں۔ سائبر دنیا میں جرائم کے لئے استعمال ہونے والے وسائل بھی ترقی یافتہ ہیں، اب انٹرنیٹ ہیکرز نے جاسوسی کرنے کے لئے سافٹ ویئر یا وائرس بنا لئے ہیں، ای میل اور ویب سائٹ کے ذریعہ ان کو پھیلایا جاتا ہے، استعمال کنندگان کو اس کا لنک بھیجا جاتا ہے اگر وہ غلطی سے بھی ایک مرتبہ اس پر کلک کردیتے ہیں ان کی تمام کارکردگی سے ہیکر واقف ہونے لگتا ہے، گزشتہ ابواب میں مذکور ٹروجن ہارس نام کا وائرس HORSETROJAN کا استعمال اس طرح کے کاموں میں ہوتا ہے، جس کمپیوٹر میں یہ وائرس پھیل جاتا ہے، اس کے بعد اس میں ہونے والی کوئی بھی کارکردگی ایسی نہیں بچتی جس کے بارے میں ہیکر کو معلوم نہ ہو سکے، یہ وائرس تمام چیزوں کو محفوظ کرتا ہے اور اس کو ہیکر کے پاس بھیج دیتا ہے، اس طرح تمام پاسورڈ و محفوظ ڈاٹا پر ہیکر اپنے ناپاک منصوبوں میں استعمال کرتے ہیں۔

بسا اوقات ONLINE رہنے کی صورت میں ہیکرز اپنے شکار کے کمپیوٹر میں سیندھ لگاتے ہیں، اور سوفٹ پروگرامس میں چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور اس صورت میں ہیکر بذات خود اپنے شکار کے کمپیوٹر یعنی اس کے گھر میں داخل ہوجاتا ہے اور اس میں سیندھ لگاتا ہے، معلومات کی چوری کرتا ہے، دستاویزات کو چوری کرتا ہے، اکثر اس طرح کے معاملات میں شکار افراد کو ہیکرز اپنا شکار ان کے فون ٹیپ کرکے بھی کرتے ہیں، ہیکر اپنے شکار کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے ان کو SMS اور کال کرتے ہیں اور ان سے ان کے پاسورڈ اور خفیہ معلومات بینک کا نمائندہ بن کر مانگتے ہیں، اگر انہوں نے معلومات دے دی تو ان کا منشا پورا ہوجاتا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ ان کے فون سنتے ہیں اور اس کے ذریعہ ان کی ذاتی محفوظ معلومات کو فاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

کچھ ویب سائٹس اپنے خریدار کی سیکیورٹی کا انتظام نہیں کرتی ہیں، اور ان کو ہیکرز سے بچانے کے لئے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا ہے، شکار اپنے کو محفوظ سمجھ کر معاملات کرتا ہے، لیکن وہ حقیقت میں ہیکرز کے جال میں پھنس جاتا ہے، ماہرین انٹرنیٹ وسائبر جرائم کے مطابق ہر کس وناکس کے لئے کریڈٹ و ڈیبٹ کارڈز کے ذریعہ آن لائن خریداری نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ ایسی معتمد علیہ ویب سائٹ پر اپنے مالی معاملات کئے جائیں جن کے بارے میں اعتماد ہو کہ اس کے ذریعہ سے وہ سائبر مجرمین کا شکار نہیں بنیں گے۔ سائبر مجرمین کی مہارت کا

اندازہ اس مثال سے لگایا ہی جا سکتا ہے ،سوئیس بینک سوئیزر لینڈ کے چیئر مین نے ایک ایسی ٹیکنالوجی ایجاد کرنے کا دعویٰ کیا جس کے ذریعہ سے محفوظ و مامون انداز میں خرید وفروخت ہوسکتی ہو،اس ریسرچ میں تقریباً چار مہینے لگے ،اس تحقیق کے پورا ہونے کے بعد پریس کانفرنس کی اور اس جدید ٹیکنالوجی کے لانچ کرنے کا اعلان کیا گیا ،چیئر مین نے جب اس کو لانچ کر رہے تھے اچانک درمیان میں ای میل آیا اور اس میں دھمکی دی گئی کہ آپ اپنے کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ کوئی رقم منتقل نہیں کر سکتے ہیں۔

(DARK SECRETS BOY) نامی سائبر مجرمین کے گروپ نے اس ٹیکنالوجی کے رسم اجراء کے موقع پرہی ای میل کر کے چیئر مین آف بینک کے اکاؤنٹ سے لندن کے کسی بڑے شاپنگ مال میں ۸۰ لاکھ امریکی ڈالر پلک جھپکتے ہی اڑادئے۔

دھوکہ دہی

دوسرا طریقہ: دھوکہ دینا ہے یعنی ایسی ویب سائٹ تیار کرنا جو مشہور ویب سائٹ کے نام سے ملتی جلتی ہو، جیسے ہی گراہک اس داخل ہوکر اپنا یوزر نام (user name) اور (Password) داخل کرے گا، اس پر شکاری اپنا پنجہ کس لیں گے اور اپنے جال میں پھنسا لیں گے، جیسے ایک مشہور ویب سائٹ amazon ہے، کسی ہیکر نے اس سے ملتی جلتی ویب سائٹ بنائی اور اس کا نام amazon / Amazun رکھا، لوگوں کے پاس ای میل بھیجے اور ان سے درخواست کی کہ کسی ضروری وجوہات کی بناء پر amazon آپ کی ضروری معلومات کا دوبارہ اندراج کرانا چاہتی ہے، براہ کرم اس میں ہمارا تعاون کریں، amazon کے استعمال کرنے والے نے اس کو صحیح جانا اس نے اس پر اپنا پاسورڈ اور یوزر نام لکھ دیا، اتنا کرنے سے اس کے اکاؤنٹ سے متعلق تمام اہم اور ضروری معلومات ہیکر کے پاس پہنچ گئی، جس کی مدد سے وہ اس کو مالی نقصان پہنچانے پر قادر ہو گیا ہے، صرف کسی مشہور ویب سائٹ کے ایک حرف یا دو حرف بدل کر لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، چنانچہ ایسا کرنا اسلامی قوانین وضوابط کے اعتبار سے بڑے گناہ کی بات ہے، اور کھلے عام دھوکہ بازی ہے جس کی اسلام نے مخالفت کی ہے۔

> حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غلہ کے ڈھیر کے پاس سے گزرے اور اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ نے اس میں کچھ تری محسوس کی تو آپ نے اس فروخت کرنے والے سے پوچھا یہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ رات میں بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہ بھیگ گیا ہے،

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا اگر یہ بھیگ گیا تھا تو تم نے اس کو اوپر کیوں نہیں کیا؟
جس نے دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔ (۱)

فقہاء کرام نے بھی اس کو حرام بتایا ہے اور اس کی حرمت پر فقہاء کا اجماع ہے:

تمام فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دھوکہ دینا حرام ہے، چاہے وہ قول کے ذریعہ ہو یا فعل کے ذریعہ اور چاہے معقود علیہ میں عیب کو چھپانے کے ذریعہ ہو یا ثمن میں یا جھوٹ بول کر ہو یا دھوکہ دے کر، اور برابر ہے چاہے وہ معاملات میں ہو یا اس کے علاوہ مشورہ اور نصیحت میں۔ (۲)

لہٰذا کسی کو جھوٹ بول کر دھوکہ دینا اور اس سے خفیہ جانکاری حاصل کر کے اس کو نقصان برداشت کرنے پر مجبور کرنا حرام ہے، انٹرنیٹ کے استعمال کرنے والے اس طرح کی دھوکہ دہی اور فریب بازی سے بچنے کے لئے اپنی ذاتی معلومات کو درج کرنے سے پہلے اطمینان اور تسلی کے ساتھ ویب سائٹ کے نام پر غور کر لیں اگر ان کو اطمینان ہو کہ کوئی ہیکر ان کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے، تبھی وہ لین دین کریں۔

❑ ٹیکنالوجی ویب سائٹ کو نقصان پہنچانا: ہائی ٹیک زندگی میں جرم کرنے کا انداز بھی نرالا ہو گیا ہے، سائبر جرائم کا نام سنتے ہی ذہن ودماغ میں نقاب پوش چور کی صورت نہیں ابھرتی؛ بلکہ ذہن میں مزید الجھن پیدا ہو جاتی ہے، آخر یہ چوری ہوتی کیسے ہے؟ ہم نے دو طریقہ ذکر کئے، اب ایک تیسرا طریقہ سیدھا ویب سائٹ پر سیندھ لگانے کا ہے جس میں تمام کے تمام کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم پاسورڈ محفوظ ہوتے ہیں، یہ چور وہاں سے اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے اس ویب سائٹ کو ہیک کر کے یہاں سے ڈاٹا چوری کرتے ہیں۔

❑ کارڈ پاسورڈ جاننے کا طریقہ: یہ پورا کا پورا سسٹم card match سسٹم کہلاتا ہے جسمیں کارڈ نمبر کے ملتے جلتے اعداد وشمار کے ذریعہ سے ایک دوسرے لوگوں کے کارڈ پاسورڈ جاننے کی کوشش کرتے ہیں، ہیکرز کے بعض گروپ اس طرح کی تک بندی میں وقت لگا کر ہائی جیک کرتے ہیں اور انٹرنیٹ ویب سائٹ پر اس کی مشق کرتے ہیں، اگر password match ہو جائے تو ٹھیک نہیں تو ہیکر اپنی کوشش جاری رکھتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **من غشنا فلیس منا**، رقم الحدیث: ۱۰۲
(۲) الموسوعۃ الفقہیہ: ۳۱/۲۱۹

□(Logg Out) نہ کرنے کی وجہ سے سائبر شکار بننا: انٹرنیٹ کو بے احتیاطی سے استعمال کرنے والے زندگی میں بڑی مصیبت میں مبتلاء ہوجاتے ہیں، عوامی جگہوں پر جیسے سائبر کیفے وغیرہ میں Logg In کیا اور اپنی ضرورت کے بقدر وہاں پر انٹرنیٹ کا استعمال کیا اور کام ختم ہونے پر کیفے سے جاتے وقت account کو Logg Out نہیں کیا، اس طرح کے مواقع کا سائبر ہیکر انتظار کرتے ہیں اور وہ موقع کو غنیمت جان کر چند منٹوں میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتے ہیں، اس لئے ہمیشہ کسی بھی طرح کے بینک سے لین دین کی صورت میں اپنے اکاؤنٹ کو Logg Out کرنا ضروری ہے، اگر ہیکر یا کسی شرپسند کے ہاتھ log In ہوا آپ کا اکاؤنٹ لگ جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی تجوری کی چابی اس کے ہاتھ لگ جائے، اس کے ذریعہ مال وجاہ اور عزت وآبرو پر ضرب لگا سکتا ہے، سوشل ویب سائٹ کے اکاؤنٹ کو کھلا چھوڑنے کی صورت میں کوئی اس کا غلط استعمال کرسکتا ہے، آپ کی جانب سے غلط تحریر جاری کرسکتا ہے، آپ کے پیج پر فحش اور غیر اخلاقی تصاویر اپلوڈ کرسکتا ہے، جس کی وجہ سے آپ کے دوستوں کے نزدیک آپ کی شخصیت مجروح ہوگی۔

آئے دن اخبارات اور نیوز چینل اس طرح کے واقعات دکھاتے رہتے ہیں، بعض جگہوں پر باپ نے اپنا اکاؤنٹ log out نہیں کیا، اور بیٹے نے اس کے اکاؤنٹ سے پیسے چرا لئے یا کسی رشتہ دار نے ایسا کیا وغیرہ، سائبر جرائم کے بارے میں مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس میدان میں اگر اپنے آپ کو دوسروں سے بچانا ہے تو اپنی حفاظت آپ کرو، مجرم تمہاری کسی بھی کمزوری کو پکڑ سکتا ہے اور تمہارا دیوالیہ نکال سکتا ہے۔

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

خالد سیف اللہ رحمانی

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت ونقاہت کی حالت میں (جس کا آپ خود مشاہدہ فرمارہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے؛ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا! اُٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ، تو ان کے دلوں پر خوف وہراس مسلط ہوجاتا ہے، خدا کا نہیں؛ بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا؛ حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے، اور دنیا کی متاعِ قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی —— آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کو سیکھنے یا دوسری قوموں کے علم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں! یہ بے شک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگ جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں یا ''حکومتِ وقت'' کی پرستش کرنے لگیں تو

ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے، اب از راہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثر بد سے اور کیا یہ وہی بات نہیں جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ: ''ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھی، صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو۔۔۔،، مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہ رہی، کیونکہ زمانے نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی اور تدبر اور ہوش مندی کے پودے نشوونما پاتے ہیں اور اس کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح کے راستے پر چل سکتا ہے، ہاں! ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو اور اغیار کے اثر سے بالکل آزاد ہو، کیا باعتبارِ عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبارِ اخلاق واعمال کے اور کیا باعتبارِ اوضاع واطوار کے (ان سب میں) ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔ ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں پر غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں اور ان عظیم الشان مدارس کے جنہوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے بیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔[۱]

یہ ایک خطبۂ صدارت کے اقتباسات ہیں، جس میں جوش وجذبہ بھی ہے غیر ملکی اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین بھی ہے تعلیم کے باب میں نہایت تجربہ کی رہنمائی ہے کہ تعلیم کسی بھی قوم وملت کا سب سے اہم شعبہ ہے اور اس کو دوسروں کے بھروسہ پر نہیں چھوڑا جا سکتا، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور ان میں طالب علموں کو اپنے طریقے سے تعلیم دیں جس میں دنیا کے ساتھ دین بھی ہو، اعلی عصری تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ طلبہ ایک اچھے مسلمان بھی بنیں۔

یہ خطبۂ صدارت اس ہستی کے ہیں جو ایک طرف علوم اسلامیہ میں مجہتدانہ نگاہ کا مالک تھا تو دوسری طرف ملک وبیرون ملک میں اس کے ہزاروں باکمال شاگرد پھیلے ہوئے تھے، ان سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ

---

(۱) خطبۂ صدارت حضرت شیخ الہند، ص: ۴ تا ۶

انگریزوں کی غلامی کا جوا سر سے اتارنے کیلئے ہمہ وقت سر بکف اور کفن بدوش تھا، اسی غم میں اس کی ہڈیاں گھلتی جاتی تھیں، اس نے ۱۸۵۷ میں انگریزوں کا بدترین ظلم دیکھا تھا، مسلمانوں کا شیرازہ حیات منتشر ہوتے دیکھا تھا، اور تعلیم کے تیزاب میں ڈال کر مسلمانوں کی نئی نسل انگریزی سانچے میں ڈھالنے کا طریقہ بھی دیکھا تھا اور اس کے اثرات بھی محسوس کیے تھے، اس نے پیرانہ سالہ میں ایک ایسی حکومت سے ٹکر لی جس کے اقتدار میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، وہ اعلیٰ علمی کمالات کے ساتھ غضب کی عملی صلاحیتیں رکھتا تھا، بڑھاپے میں بھی اس کا عزم جوان تھا اور جوانوں کو شرماتا تھا، ملک وملت کی سربلندی کیلئے اس نے وطن سے دور پردیس میں برسوں قید وبند کی صعوبتوں کو بھی برداشت کیا لیکن راہ اور منزل کا فرق اس پر کبھی مشتبہ نہیں ہوا، اس باکمال اور ہمہ جہت شخصیت کو دنیا شیخ الہند کے نام سے یاد کرتی ہے۔

پس منظر

اٹھارہوں اور انیسویں صدی عالم اسلام کیلئے نہایت پر آشوب تھی، عالمی سیاست کے افق پر مغربی استعمار کا سورج طلوع ہوا، مغربی استعمار کے جلو میں جہاں ایک زندہ قوم کی خصوصیات تھیں، وہیں ٹکنالوجی کی قوت اور نظم وضبط کی طاقت بھی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے مسلم ممالک مغربی استعمار کا شکار ہوتے گئے، ماضی کے حکمرانوں کی توسیع سلطنت سے مغربی استعمار بہت مختلف تھا، پہلے حکمرانوں کو صرف زمینی قبضہ مطلوب ہوتا تھا، مفتوحین کے عقائد واعمال اور ان کے رسوم ورواج میں وہ دخل نہیں دیتے تھے، مغربی استعمار نہ صرف زمین پر قبضہ کا خواہاں اور اس علاقہ کی دولت اور وسائل کو لوٹ کر لندن اور پیرس بھیجنا چاہتا تھا، بلکہ دل ودماغ پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا کہ کل ہو کر ہمارا یہ زمینی قبضہ ختم بھی ہو جائے تو دل ودماغ پر قبضہ ہو جائے، اسی کے ساتھ وہ اس کا بھی خواہاں تھا کہ لوگوں کو اپنے مذہب سے پھیر کر عیسائیت کے رنگ میں رنگ دے۔

ان پر آشوب حالات میں حضرت شیخ الہند پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی مولانا ذوالفقار علی صاحب دیوبند کے معززین میں شمار ہوتے تھے، انسپکٹر آف اسکولز تھے، گھر میں زمین داری بھی تھی جس سے گھر میں خوشحالی تھی، آپ مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے، علمی استعداد اعلیٰ درجہ کی تھی، درس نظامی کی متعدد کتابوں پر آپ کا حاشیہ ہے، جس سے طلبہ آج بھی فائدہ اٹھاتے ہیں، حضرت شیخ الہندؒ ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے، آپ کا نام محمود حسن رکھا گیا، جب ۱۸۵۷ کا معرکہ بپا ہوا، جس کا ایک مرکز میرٹھ بھی تھا، اس وقت آپ میرٹھ میں ہی تھے، اور آپ کی عمر اس وقت ۷ سال تھی، کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانیوں بلکہ مسلمانوں کے

جذبہ سرفروشی اور انگریزوں کے ظلم وستم کے لرزہ خیز اور روح فرسا واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آپ کی فطرت میں ودیعت جذبہ جہاد ومقاومت کو مزید جلا ملی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد آپ کا داخلہ دیوبند میں ۱۸۶۶ء میں ہوا، اس وقت دیوبند کے مدرس اول کا نام بھی محمود تھا اور شاگرد بھی محمود تھا، ان دونوں ''محمودین'' کے اجتماع کا نتیجہ دیوبند کی علمی وفکری تاریخ میں بڑا مبارک اور نیک فال ثابت ہوا، اور علم وفکر کی جو تاریخ دیوبند میں مرتب ہوئی، کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا اثر محمود نہیں ہوا، آپ کے اساتذہ میں ملا محمود کے علاوہ حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، حضرت مولانا سید احمد دہلویؒ اور سب سے بڑھ کر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ہیں، حضرت نانوتویؒ بغرض ملازمت اور تصحیح کتب دیوبند میں مستقل قیام نہیں فرماتے تھے، اس لیے آپ نے حضرت نانوتویؒ کی مستقل رفاقت اختیار کی اور حضرت نانوتوی جہاں کہیں تشریف لے جاتے، آپ بھی ان کے ساتھ جاتے، اس طرح حضرت نانوتویؒ کے ساتھ مستقل رہ کر آپ نے ان سے صحاح ستہ اور حجۃ اللہ البالغہ وغیرہ کا درس لیا۔ حضرت نانوتویؒ کو اللہ تعالیٰ نے اسرار وحکم کا جو علم عطا کیا تھا، اس سے دنیا واقف ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب کتاب اسرار ورموز شریعت کے رمز شناس حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ ہو، پڑھانے والے متکلم اسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ ہوں اور پڑھنے والے حضرت شیخ الہندؒ ہوں تو افادہ اور استفادہ کا کیا عالم رہا ہوگا، خود حضرت شیخ الہندؒ کا بیان ہے:

> میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تصانیف دیکھ کر حضرت نانوتویؒ کے درس میں حاضر ہوتا تھا، اور وہ باتیں پوچھتا تھا جو شاہ صاحب کی تصنیفات میں غایت درجہ مشکل ہوتی تھیں، شاہ صاحبؒ کے یہاں جو آخری جواب ہوتا تھا، وہ حضرت نانوتویؒ اول ہی مرتبہ میں فرما دیتے تھے، میں نے بار بار اس کا تجربہ کیا ہے۔ (۱)

آپ سنہ ۱۲۸۹ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے اور دارالعلوم دیوبند کے پہلے اجلاس دستار بندی ۱۲۹۰ھ میں آپ کو دستار فضیلت بھی دی گئی۔

تعلیم وتدریس

جب آپ دارالعلوم دیوبند میں طالب علم ہی تھے کہ ۱۲۸۸ھ مطابق ۷۲-۱۸۷۱ء میں آپ کا

(۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند: ۱/ ۱۱۳

دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت معین مدرس تقرر ہوا، اور بعد فراغت ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں آپ کو مستقل مدرس مقرر کیا گیا، پہلے سال میں آپ نے قطبی اور قدوری پڑھائی، دوسرے سال ہی آپ کے اساتذہ اور دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں نے آپ کی اعلیٰ علمی استعداد اور جوہر قابل کو دیکھتے ہوئے، مشکوٰۃ شریف اور ترمذی شریف جیسی حدیث کی اہم کتابوں کی تدریس آپ کے سپرد کردی، اور ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء سے آپ نے بخاری جلد دوم پڑھانا شروع کردیا اور ۱۳۰۵ھ میں آپ دارالعلوم دیوبند کے مدرس اول یا صدر مدرس اور شیخ الحدیث دونوں عہدوں پر بیک وقت فائز ہوئے اور پوری بخاری شریف کا درس دینا شروع کیا۔

سفر حج

دارالعلوم دیوبند میں تقرر کا تیسرا سال تھا کہ سفر حج کا غلغلہ بلند ہوا، جس میں ہندوستان کی منتخب اور نادر روزگار شخصیات نے سفر حج کا ارادہ کیا تھا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا شاہ رفیع الدین صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند وغیرہم بھی حج کے اس قافلہ میں شامل تھے، حضرت شیخ الہندؒ بھلا ایسا مبارک موقع کیسے چھوڑتے، آپ نے بھی بے سروسامانی کے باوجود سفر حج کا ارادہ کیا اور ان اکابر کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوگئے، حضرت شیخ الہندؒ نے اکابر کے ساتھ اپنے سفر کو ان اکابرین کو نظر بد سے بچانے کا ٹیکہ قرار دیا ہے، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

> دیکھا بھالی بعض بعض ہم جیسوں نے بھی دفعیہ نظر بد کے لئے ہمرکابی اہل اللہ اور گردافشانی راہ بیت اللہ اختیار کی اور بہ برکت اقدام اکابر مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوکر وطن واپس آگئے۔ (۱)

سفر حج یوں تو مبارک اور مسعود ہوتا ہی ہے لیکن آپ کیلئے کئی طرح کی نعمتوں سے سرفرازی کا بھی باعث ہوا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی سفارش پر سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ نے آپ کو اجازت وخلافت سے نوازا، ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا جو سلسلہ سند کے مدار حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب ہجرت کرکے مکہ چلے گئے تھے، ان سے بھی اجازت حدیث حاصل ہوئی، بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے اکابر خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ادب کی وجہ سے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے اجازت حدیث لینے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا لیکن خود حضرت نانوتویؒ نے توجہ دلائی اور کہا کہ حضرت شاہ عبدالغنیؒ سے

(۱) مقدمہ ایضاح الادلہ

اجازت حدیث حاصل کرو، واپسی کے سفر میں بڑی تکلیف ہوئی، حضرت نانوتویؒ کی طبیعت خراب تھی، جہاز پر ان کی طبیعت مزید خراب ہوگئی، آپ نے پورے جی جان اور ذوق وشوق سے حضرت نانوتوی کی خدمت کی اور ان کے آرام وراحت کا ہر مرحلے پر خیال رکھا، دوسرا سفر حج آپ نے تب کیا جب شوال ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۰۱۵ء میں ہندوستان سے ہجرت کر کے حجاز تشریف لے گئے، آپ ذی قعدہ میں وہاں پہنچے، اور اسی سال حج ادا کیا اور دوسرے سال یعنی ۱۳۳۴ھ میں دوسرا حج ادا کیا، دوسرے حج کے بعد ہی آپ کی گرفتاری عمل میں آئی اور مالٹا میں قید کیے گیے۔ اس طرح حضرت شیخ الہندؒ نے کل تین حج ادا فرمائے۔

تیسرے حج کے بعد ہی ہندوستان میں ریشمی رومال کی تحریک کے سلسلہ مین حضرت شیخ الہند گرفتار ہوئے اور مالٹا میں آپ تقریباً تین سال قید رہے، ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۴ جون ۱۹۲۰ء کو دیوبند پہنچے، رہائی کے بعد آپ نے مختلف مقامات کا ملی اور قومی ضروریات کے تحت سفر فرمایا، آخری سفر علی گڑھ کا تھا، اسی دوران طبیعت ناساز ہوتی گئی، ڈاکٹر انصاری صاحب نے نہایت توجہ سے علاج کیا لیکن مرض بڑھتا گیا ۳۰ر نومبر کو حالت زیادہ بگڑ گئی، اس وقت آپ نے فرمایا:

> مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں، تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے جرم میں میرے ٹکرے کیے جاتے۔ (۱)

اس کے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ فرمایا اور آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی، زبان تالو سے جا لگی تھی، ارد گرد یسین شریف پڑھا جا رہا تھا، یاسین شریف کی تلاوت مکمل ہونے سے قبل ہی آپ کا انتقال ہوگیا، وہ بے چین روح جو ستر سال سے ملک کی آزادی، مسلمانوں کی سربلندی، اسلام کے غلبہ کے لئے ہمہ وقت سربکف اور کفن بدوش تھی، اسے چین وقرار آ گیا، بھلے ہی اس کے منصوبے بہ ظاہر کامیاب اور عزائم شرمندہ تعبیر نہیں ہوئے؛ لیکن اس نے جد وعمل کی اور عزیمت کی ایسی داستان رقم کردی کہ نہ جانے کتنوں کو آپ کے اقدام سے حوصلہ ملا۔

تصوف وسلوک

انسانی جسم میں دل کو بڑی اہمیت ہے، ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق جسم کا یہی ایک ٹکڑا ایسا ہے

---

(۱) تذکرہ حضرت شیخ الہند، ص: ۲۸۵

جس سے پورے جسم کی صلاح وفلاح اور ظاہر وباطن کی ترقی وابستہ ہے، خدا کے یہاں بھی وہی دل مقبول ہے جو تمام باطنی امراض کبر، ریا، نفاق وغیرہ سے پاک اور فضائل جیسے تواضع، خشیت الٰہی، اخلاص وغیرہ سے آراستہ ہو، اور صحیح معنوں میں وہ قلب سلیم ہو، ہر دور میں اہل علم نے اس کی فکر کی ہے اور اہل دل حضرات کی صحبت میں رہ کر، ان کی ہدایات سے مستفید ہوکر قلب کو قلب سلیم بنانے کی محنت کی ہے اور اس کے بعد ہی علم میں نور اور شخصیت میں نکھار آتا ہے، اور خالق سے رشتہ استوار ہوتا ہے تو خلق میں بھی وہ مقبول ومحبوب بن جاتا ہے۔

حضرت شیخ الہند نے اپنا اصلاحی تعلق حضرت نانوتوی سے قائم کیا، ۱۲۹۴ھ میں حضرت نانوتوی اور دیگر اکابر کے ساتھ حج پر گئے تو سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے بھی اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا، حج سے واپسی کے بعد اور حضرت نانوتوی کے انتقال کے بعد آپ نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے اپنا اصلاح تعلق قائم کیا، اور ان کی رہنمائی میں تصوف وسلوک کی منزلیں طے کیں، حضرت شیخ الہند پہلے پہل لوگوں کو بیعت کرنے سے مناسبت نہیں رکھتے تھے؛ لیکن جب عوام الناس کا بکثرت رجوع ہوا تو لوگوں کو بیعت کرنا شروع کیا، اولاً تو زیادہ تر دیوبند کے طلبہ ہی آپ سے متاثر ہوکر آپ سے بیعت ہوتے تھے، دوسرے: ملک کے مختلف حصوں میں آپ کا سفر ہوتا تھا تو وہاں بکثرت عوام الناس آپ سے بیعت ہوتے تھے، لوگوں کو کثرت سے بیعت کرنے کے باوجود اجازت وخلافت کے معاملے میں بڑے محتاط تھے، اور محض چند افراد کو ہی آپ سے اجازت وخلافت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت شیخ الہند اور علمی خدمات

حضرت شیخ الہند کو اللہ نے علوم اسلامیہ میں مجتہدانہ نگاہ عطا کی تھی، آپ کی شخصیت ہمہ جہت تھی، آپ فقیہ بھی تھے اور محدث ومفسر بھی، دن میں دارالعلوم دیوبند کی درسگاہ میں باوقار مدرس اور بخاری شریف پڑھانے والے شیخ الحدیث تھے تو رات میں عابد شب زندہ دار بھی تھے اور رزم حق وباطل میں فولادی عزائم رکھنے والے مجاہد بھی، ایک جانب جہاں آپ نے قرآن وحدیث اور فروعی مسائل پر تحریری صلاحیتیں صرف کیں وہیں آپ کا ذہن نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام سے فرنگی طاقت کو مٹانے کی تدبیریں سوچتا رہتا تھا، یوں تو شاہ عطاء اللہ بخاریؒ نے علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں کہا تھا کہ صحابہ کا قافلہ جارہا تھا، آپ پیچھے رہ گئے، لیکن غور سے دیکھئے تو یہ جملہ حضرت شیخ الہند پر زیادہ منطبق ہوتا ہے، وہ رہبان باللیل اور فرسان بالنہار کی تصویر تھے، علم کے میدان میں رازی تھے تو جنگ کے میدان غازی تھے، آپ

خدمت دین کے کسی ایک شعبہ سے بندھے ہوئے نہیں تھے، بلکہ اسلام کی سربلندی کیلئے جب جیسی ضرورت پڑتی، وہ قربانی دینے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے۔

قرآن پاک پر آپ کا ترجمہ قرآن اور تفسیری حواشی اس بات کے ثبوت ہیں کہ قرآن کریم کے معانی ،مطالب اور مقاصد پر آپ کی نگاہ کتنی گہری تھی اور آپ نے قرآن کریم کی تفاسیر کا ہی صرف مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ خود بھی برسوں قرآن کریم آپ کے غور وفکر اور تدبر و تفکر کا مرکز توجہ رہا تھا، بخاری شریف کے ابواب وتراجم میں امام بخاری نے بکثرت قرآنی آیات استعمال کی ہیں اور مابعد کی حدیث سے ان آیات قرآنی کا ربط پیدا کیا ہے، اس تعلق سے بھی قرآن کریم آپ کی فکر وتوجہ کا تقریبا چالیس سال مرکز رہا تھا۔

حدیث شریف

آپ کا دیوبند میں ۱۲۹۲ھ میں تدریس کیلئے تقرر ہوا اور ۱۲۹۳ء میں آپ کو مشکوٰۃ اور ترمذی شریف جیسی اہم کتب حدیث آپ کو تدریس کیلئے دی گئیں، ۱۲۹۵ھ سے بخاری اور صحاح ستہ کی دیگر کتابیں پڑھانی شروع کیں، حضرت شیخ الہند نے بخاری کے علاوہ ترمذی اور ابوداؤد شریف کا بھی برسوں تک طلبہ کو درس دیا ہے، حضرت شیخ الہند کی حدیث میں گہری نگاہ اور نظر کا ہی کمال تھا کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جیسے باکمال علماء بھی خالی گھنٹہ میں آپ کے درس میں طلبہ کی صف میں بیٹھتے تھے، دوران درس جو نکات ومعارف آپ بیان کرتے تھے وہ کتابی سے زیادہ وہبی ہوتے تھے، حدیث کے جن معانی کی جانب شارحین کی نگاہ نہیں گئی، آپ ان کی بھی طرف رہنمائی فرماتے بہت مختصر کلام فرماتے، ظاہر بین کو لگتا کہ محض معمولی باتیں ہیں لیکن اہل علم وفضل ہی سمجھتے تھے کہ اس سطح کے نیچے شرح حدیث کے کتنے جواہر پارے چھپے ہیں۔

درس کا حال

آپ کا درس نہایت مہذب ہوتا تھا، حدیث کے آداب جو محدثین کرام نے بتائے ہیں، ان کا پورا خیال رکھا جاتا، سوال واعتراض کی طلبہ کو پوری آزادی تھی، بسا اوقات درس گاہ مجلس مناظرہ کا منظر پیش کرتی تھی؛ لیکن اس میں بھی سلیقہ اور تہذیب شرط تھی، آپ کے شاگرد اور آپ کے روز وشب کے واقف کار حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ نے آپ کے درس کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بڑا موثر ہے، طوالت کی وجہ سے اس کے

کچھ ٹکڑے نقل کیے جاتے ہیں:

> مولانا کا حلقہ درس نہایت مہذب اور شائستہ ہوتا تھا، دوسرے مدارس کے فارغ یافتہ اور بڑے بڑے ذہین طالب عالم نہایت مودب طریق سے حاضر خدمت رہتے ، اور حضرت کمال عظمت ووقار سے درس دیتے ،مستعد طالب عالم بار بار اور طرح طرح سے اپنے شکوک وشبہات پیش کرتے تھے، اس طرح کہ حلقہ درس بالکل مجلس مناظرہ بن جاتی تھی ،کبھی حضرت کے الزامی جوابات طالب علم کو ساکت کردیتے اور کبھی جامع مانع تقریر شفاء لمافی الصدور کا کام دیتی تھی، الزامی جواب میں ملکہ تام تھا اور اس خوبی وقوت استدلال سے تقریر فرماتے کہ سائل کو شرح صدر ہوجاتا، بہت سے ذہین ذی استعداد طالب علم جو مختلف اساتذہ کی خدمتوں سے استفادہ کرنے کے بعد حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے ،اپنے شکوک وشبہات کے کافی جواب پانے کے بعد حضرت مولانا کی زبان سے آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے معانی اور مضامین عالیہ سن کر سر نیاز ختم کرکے معترف ہوتے کہ یہ علم کسبی نہیں ہے اور ایسا محقق عالم دنیا میں نہیں ہے، حلقہ درس دیکھ کر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقہ تحدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا۔ (۱)

چونکہ آپ نے ۱۲۹۵ سے بخاری شریف جلد دوم اور ۱۳۰۵ھ سے مکمل بخاری کا درس دینا شروع کیا اور ۱۳۳۳ھ تک درس دیتے رہے، بخاری شریف کو آپ نے حضرت نانوتوی سے بڑے غور وفکر سے پڑھا تھا اور خود بھی اس کے مضامین ومطالب میں طویل عرصہ تک غور وفکر کیا تھا، اس لیے اس کے مضامین ومطالب پر حاوی تھے، اور اثناء درس ایسے مضامین عالیہ اور نکات بیان کرتے تھے جو کتابوں میں نہیں ملتیں ،حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے آپ کے درس بخاری کی جو منظر کشی کی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے:

> سیدنا شیخ الہندؒ کی ژرف نگاہی اور ان کے حکیمانہ نقطۂ نظر کا سب سے زیادہ تجربہ اس وقت ہونے لگا، جب بخاری شریف شروع ہوئی، بخاری مہمات میں جیسا کہ

(۱) حیات شیخ الہند، ص: ۳۴

جاننے والے جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ اہم تراجم ابواب کا معاملہ ہے، قرآنی آیات میں مناسبت اور باہمی ربط قرآن کی سب سے بڑی حکمت ہے، اسی طرح امام بخاری کے تراجم ابواب کا رنگ بھی قریب قریب وہی ہے، بظاہر بے ربطی میں ہی ربط کا راز پوشیدہ ہوتا ہے، ——— حقیقت یہ ہے کہ جس وقت تراجم ابواب کی بحث شیخ الہندؒ کے حلقے میں چھڑ جاتی تھی، تو حضرت والا پر بھی خاص حال طاری ہوجاتا تھا اور سننے والے بھی محوحیرت بن جاتے تھے، وجد کی سی کیفیت میں معلوم ہوتا تھا کہ سارا مجمع ڈوب گیا، كأن على رؤوسهم الطير کا منظر قائم ہوجاتا تھا، وہ خود بھی کھل جاتے تھے اور سننے والے بھی کھلے جاتے تھے، نئے معارف، جدید حقائق جو نہ کبھی سنے گئے اور نہ پڑھے گئے، معلوم ہوتا تھا کہ ان سے پردے ہٹ رہے ہیں، دل کی گرہیں واہوتی چلی جاتی ہیں۔ (۱)

اعتدال وتوازن

حضرت شیخ الہندؒ کو حضرت امام ابوحنیفہ سے خاص تعلق خاطر تھا، اس کے باوجود تمام ائمہ کرام کا نام نہایت ادب واحترام سے لیا کرتے تھے، کوئی لفظ ایسا نہیں بولتے تھے یا لہجہ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا جس سے کسی بھی قسم کی تنقیص کا شائبہ تک ذہن میں آئے، فقہ حنفی کے مسائل کو ثابت کرنے کے باوجود (اوراس کے ثبوت کی ضرورت بھی اس لیے پڑتی تھی کہ بعض گوشوں سے مسلسل یہ بات دہرائی جاتی تھی کہ فقہ حنفی کے مسائل قرآن وحدیث کے خلاف ہیں، ایسی بے بنیاد باتوں کی تغلیط وتردید کیلئے ہی ایسے مسائل کو ثابت کرنے کی ضرورت اورنوبت آئی ہے، ورنہ حدیث سے زبردستی مسلک ثابت کرنا کبھی ان کا شعار نہیں رہا) ائمہ کا ادب واحترام کرنے کی طلبہ کو تلقین فرماتے اور کہتے کہ تمام مجتہدین کرام برحق ہیں، اوران کی شان میں گستاخی موجب خسران وبربادی ہے اورامام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ساتھ آپ کو جس شخصیت سے سب سے زیادہ تعلق خاطر تھا، وہ امام بخاریؒ تھے۔

حدیث میں رسوخ

طویل عرصہ تک حدیث کے درس کی وجہ سے آپ حدیث کے علل سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ

---

(۱) احاطہ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن

طویل عرصہ تک حدیث سے ممارست کا نتیجہ یہ تھا جیسا کہ محدثین نے بیان کیا ہے کہ انسان مزاج نبوی کا اداشناس ہوجاتا ہے،آپ بھی حدیث کے پس منظر، واقعہ کی صورت حال کے مطابق توجیہ اوراحادیث میں تعارض کی صورت میں تطبیق سے پوری طرح واقف تھے، ذیل میں اس کے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں،ایک ہی مسئلہ میں متنوع قسم کی احادیث سامنے آتی ہیں، اس باب میں محدثین کے مختلف طریقے رہے ہیں،بعض ان میں تضاد مان کر تطبیق کی شکل اختیار کرتے ہیں،بعض اس کوتنوع پر محمول کرتے ہیں اور بعض زمانی اختلاف کی وجہ سے ناسخ ومنسوخ کی طرف جاتے ہیں،حضرت شیخ الہندؒ نے اس بارے میں ایک نہایت عمدہ اصول بیان کی ہے جس کو ذہن میں رکھا جائے تو بہت سارے اشکالات خود ہی ختم ہوجائیں گے:

> آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو مختلف اعمال منقول ہیں، وہ دو قسم کے ہیں،بعض اعمال تو ایسے ہیں جن کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو معمول بنالیا تھا، یا آپ سے وہ اعمال کثرت کے ساتھ ثابت ہیں، یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو کرنے کا حکم دیا ہے؛لیکن بعض اعمال ایسے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اکادکا موقع پر ثابت تو ہیں ؛لیکن ان کو معمول بنالینا یاان کا التزام کرنا یا دوسروں کو ان کی ترغیب دینا ثابت نہیں ہے، ان دونوں قسموں میں سے ہرایک کو اپنے مقام پر رکھنا چاہئے ،پہلی قسم کے اعمال کی پابندی کا اہتمام درست اور موافق سنت ہے؛لیکن دوسرے قسم کے اعمال کو ان کے مقام پر رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو اسی طرح کبھی کبھار کرلیا جائے جیسا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا لیکن ان کا مستقل معمول بنالینا مطلوب نہیں،حضرت شیخ الہندؒ نے اس کی مثال یہ بیان فرمائی کہ رکوع سے اٹھتے وقت ربنا لک الحمد کہنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ومسنون ہے ؛لیکن حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ امامت فرمارہے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکوع سے اٹھتے وقت سمع اللہ لمن حمدہ فرمایا تو کسی صحابی نے قدرے بلند آواز میں کہا:
>
> ربنا لك الحمد حمداً كثيراً طيباً مباركاً عليه كما يحب ربنا ويرضى.

> نماز ختم ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا یہ کلمہ کس نے کہا تھا؟ اور جب وہ صحابی حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا یہ کلمہ فرشتوں کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو آسمان پر لے جانے کیلئے ستر سے زیادہ فرشتے لپکے تھے۔
> حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کلمہ کی اتنی فضیلت بیان فرمائی؛ لیکن روایات میں یہ کہیں مروی نہیں ہے کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یا دوسرے صحابہ کرامؓ نے ربنا لک الحمد کے ساتھ ان کلمات کے اضافہ کو معمول بنالیا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد اس کلمہ کی نفس فضیلت بیان فرمانا تھا، یہ مقصد نہ تھا کہ نماز میں اس کلمہ کا التزام کیا جائے؛ البتہ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابیؓ کے اس عمل پر نکیر بھی نہیں فرمائی، اس لیے اگر کوئی شخص کبھی کبھار یہ کلمہ کہہ لے تو جائز ہے؛ لیکن اس واقعہ کی بنیاد پر اس کلمہ کو نماز کا مستقل جز بنالینا درست نہیں۔ (۱)

سورج گہن کے وقت جو نماز پڑھی جاتی ہے اس میں تعدد رکوع کی بحث حدیث کی اہم بحثوں میں سے ہے، فقہاء شوافع آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس نماز میں تعدد رکوع سے استدلال کرتے ہیں اور ایک سے زائد رکوع کے قائل ہیں، احناف ایک رکوع کے قائل ہیں اور تعدد رکوع کو کسی خاص امر اور کیفیت وحالت پر محمول کرتے ہیں، اس بارے میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے سوال آپ نے جو جواب دیا، وہ آپ کی حدیث کو اس کے پورے سیاق وسباق میں سمجھنے کی عمدہ مثال ہے:

> ایک دفعہ آپ نے مجھے فرمایا کہ صلوٰۃ کسوف میں تعدد رکوع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے غالبا یہ کسی وجہ کی بناء پر آپ کی خصوصیت ہے، لیکن آپ نے امت کو خطاب کر کے فرمایا:
> صلوا كأحدث صلوة صليتموها من المكتوبة.
> تم نے جو فرض نماز ابھی تازہ تازہ پڑھی ہے، یعنی فجر کی نماز، اس صلوٰۃ کسوف کو بھی اسی طرح پڑھو۔

---

(۱) تذکرے، ص: ۲۰۰

میں نے عرض کیا کہ حضرت! حضرات علماء شافعیہ اس تشبیہ کو محض تعداد رکعات پر محمول کرتے ہیں، وحدت رکوع پر محمول نہیں کرتے، آپ نے فرمایا: یہ تو ایک بدیہی کو نظری کرنا ہوا، اس لیے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسوف کی نماز تعدد رکوع کے ساتھ خود ہی تمام لوگوں کے سامنے مجمع عظیم کو پڑھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کیلئے تعدد رکوع کو ہی مشروع قرار دینا چاہتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر اکتفا کیوں نہیں فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل تو لوگوں نے اس وقت دیکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل بھی حجت شرعی ہے، صرف عمل پر اکتفا نہ کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح کی نماز کے ساتھ تشبیہ دی اور قول کے ساتھ امت کو حکم دیا، اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ واضح فرماتے ہیں کہ تعدد رکوع کسی عارض کی وجہ سے ہے اور امت کو وہ طریقہ بتلایا جو نماز کے بارے میں معروف طریقہ ہے۔ (۱)

حضرت شیخ الہند حدیث کے درس کو صرف حدیث کے ظاہری الفاظ کی تشریح تک محدود نہیں رکھتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال افعال کے اسرار وحکم بھی بیان فرماتے تھے، جس سے جہاں ایک جانب جہاں اسلام کے احکام پر یقین بڑھتا ہے، وہیں عمل میں بھی رغبت ہوتی ہے، چنانچہ وضو کے بعد بچے ہونے پانی کو پینے اور تہبند کے رومال پر پانی کے چھینٹے مارنے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وضو کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچا ہو پانی پی لیتے تھے اور بچے ہوئے پانی سے ہی اپنے تہبند کے رومال پر پانی کے چھینٹے مارتے تھے، عام علماء نے تو تہبند پر چھینٹے مارنے کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سے وسوسہ ختم ہو جاتا ہے جو بعض لوگوں میں پیشاب کے چھینٹے کے تعلق سے ہوتا ہے، حضرت شیخ الہند نے جو توجیہ فرمائی ہے، وہ نہایت لطیف ہے، فرمایا کہ حدیث میں آتا ہے کہ انسان دو چیزوں کی حفاظت کی ضمانت لے تو میں اس کیلئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں، منہ اور شرمگاہ؛ کیونکہ بیشتر گناہوں کا مصدر یہی دونوں ہوتے ہیں، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک

---

(۱) مقام محمود، ص: ۶۶

طرف تو وضو کا بچا ہوا پانی پی کر منہ کی طہارت کی طرف توجہ دلاتے تھے ، دوسرے جانب تہبند پر چھینٹے مار کر شرمگاہ سے ہونے والے گناہوں پر توجہ دلانا مقصود ہوتا تھا۔ (۱)

حضرت شیخ الہندؒ حدیث نبوی پڑھاتے ہوئے انسانی نفسیات کے مغالطے کی جانب بھی توجہ دلاتے تھے کہ اس سے آدمی دھوکے میں نہ پڑے ؛ بلکہ حدیث کا صحیح مفہوم سمجھے اور اس کی روح کے مطابق عمل کرے، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے اس حدیث کے بارے میں آپ سے سوال کیا جس میں کہا گیا ہے کہ کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میں اس کے ماں باپ اور بال بچے اور مال ودولت سے زیادہ عزیز نہ ہوجاؤں، اس پر مولانا گیلانی نے عرض کیا کہ یہ نعمت تو عام مسلمانوں کو بھی حاصل ہے کہ ماں باپ تک کی توہین برداشت کر لیتے ہیں ؛لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ادنیٰ گستاخی کی بات برداشت نہیں کر سکتے، اس پر آپ نے جو کہا، وہ جہاں انسانی نفسیات کی گرہیں کھولتا ہے، وہیں بہت سوں کے اس بارے میں مغالطے بھی دور کرتا ہے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے یا اپنی انا چور ہونے کا صدمہ، یہ ژرف نگاہی، حقیقت شناسی حضرت شیخ الہند کا ہی حصہ تھا، آپ نے فرمایا:

> اس کی تہہ تک تمہاری نظر نہیں پہنچی، محبت کا اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی مرضی کے آگے ہر چیز قربان کی جائے لیکن عام مسلمانوں کا جو برتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مرضی مبارک کے ساتھ ہے، وہ بھی ہمارے تمہارے سامنے ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے کیا چاہا تھا اور ہم کیا کر رہے ہیں، اس سے کون ناواقف ہے پھر سبکی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو مسلمانوں کیلئے ناقابل برداشت بن جاتی ہے، اس کی وجہ محبت تو نہیں ہوسکتی، خاکسار نے عرض کیا تو آپ ہی فرمائیں ،اس کی صحیح وجہ کیا ہے؟ نفسیات انسانی کے اس مبصر حاذق نے فرمایا کہ سوچو گے تو درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سبکی میں اپنی سبکی کا غیر شعوری احساس پوشیدہ ہوتا ہے، مسلمانوں کی خودی اور انانیت مجروح ہوتی ہے، ہم جسے اپنا پیغمبر اور رسول مانتے ہیں، تم اس کی اہانت نہیں کر سکتے ، چوٹ

(۱) تذکرے، ص: ۱۹۷

درحقیقت اپنی اسی ''ہم'' پر پڑتی ہے، لیکن مغالطہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت نے انتقام پر ان کو آمادہ کیا ہے۔ (۱)

حضرت شیخ الہند کو امام ابوحنیفہؒ سے عشق تھا، جب ائمہ کرام کے مسالک پر اور ان کے دلائل پر تقریر فرماتے تو جب امام ابوحنیفہ کے دلائل دینے کی باری آتی، چہرے پر خاص انشراح اور دل میں انبساط ہوتا جس کو حاضرین بھی محسوس کرتے، اور ایسے ایسے عجیب نکتے، دقائق بیان کرتے جو محض عطیہ الٰہی کے قبیل سے ہوتے، یا جب کبھی کسی مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ اور صاحبین بھی ایک طرف اور امام ابوحنیفہ تنہا ایک طرف ہوتے تو فرماتے ضرور یہاں کوئی ایسا باریک نکتہ، غامض حقیقت اور دقیق پہلو ہوگا جہاں تک صرف امام ابوحنیفہؒ کی نگاہ پہونچی ہوگی اور اسی وجہ سے وہ اس مسئلہ میں سب سے الگ ہیں اور ان مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے اثبات پر جب زبان کھلتی تو حقائق ومعارف کا دریا موجزن ہوتا، اور اس قوت کے ساتھ اس مسئلہ کو دلائل سے ثابت کرتے لگتا کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ ہی مصیب ہیں اور باقی مخطی ہیں۔

فقہ، اصول فقہ اور علم کلام

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام ہی علوم میں مجتہدانہ نگاہ اور وسعت علم سے نوازا تھا، حدیث اور فقہ کا گہرا ربط ہے، فقہ میں بھی آپ کو اللہ نے گہرا علم عطا فرمایا تھا، شروع میں دیوبند میں علاحدہ طور پر کوئی دارالافتاء نہیں تھا، لوگ جس مدرس سے چاہتے فتوی پوچھ لیتے، اور وہ کبھی فتوی زبانی یا تحریری دے دیتا، حضرت شیخ الہندؒ نے بھی بہت سارے فتاوی زبانی اور تحریری دیئے، لیکن ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے، بعد میں جب دارالافتاء وجود میں آیا تو جواب پر نظر ثانی کرنے والوں میں حضرت شیخ الہند بھی تھے، آپ دارالافتاء سے جاری ہونے والے ہر فتوی کو دیکھتے تھے اور دستخط فرماتے تھے۔ ادلہ کاملہ، ایضاح الادلہ اور احسن القریٰ فی توضیح اوثق العریٰ وغیرہ آپ کی فقہی تصانیف ہیں اور فقہ میں آپ کے تبحر پر شاہد عدل ہیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا فقہی علم جزئیات تک محدود نہیں تھا؛ بلکہ آپ مقاصد شریعت اور اصول فقہ میں بھی گہرا رسوخ رکھتے تھے، اور فروع کے ساتھ اصول پر بھی حاوی ہیں، جنگ بلقان میں اوقاف کی آمدنی سے سپاہیوں کی دوا اور دیگر ضروریات میں خرچ کرنے پر آپ نے جو فتوی دیا ہے وہ آپ کی فقہ میں گہری نگاہ کی روشن مثال ہے جس میں فقہاء کی تفریعات اور مقاصد شریعت دونوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

---

(۱) احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، ص: ۱۵۵

باکمال شاگرد

جیسے درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ویسے ہی استاد کے فضل وکمال کا معیار بھی بسا اوقات اس کے شاگردوں سے لگایا جاتا ہے، اس پیمانے پر اگر حضرت شیخ الہند کی ذات کو پرکھا جائے تو بلا مبالغہ ہندوستان میں آپ کا کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے، آپ نے جتنے باکمال شاگرد تیار کیے اور متنوع علوم وفنون میں تیار کیے، ہندوستان میں اس کی مثال نہیں ملتی، ایک جانب اگر علم حدیث میں علامہ انور شاہ کشمیری آپ کی نیابت کررہے تھے تو دوسری طرف حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب فقہ میں آپ کے جانشیں تھے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب علم کلام اور تصنیف وتحریر میں آپ کے خلف الصدق تھے تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ تصوف وسلوک میں آپ کا عکس جمیل، حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھی آپ کے مجاہدانہ جذبات کی تصویر کامل تھے تو مولانا سید اصغر حسین صاحب عاجزی، فروتنی اور علم کے ساتھ حلم کا نقش کامل تھے، حقیقت یہ ہے کہ علم کی دنیا میں افراد سازی کے کام میں اللہ نے جو مہارت اور رسوخ آپ کو دیا تھا، اس کی نظیر اور مثل ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے شاگردوں ہی میں سے ایک میرے دادا بھی تھے، جن کو دارالعلوم کے ذمہ داروں نے فراغت کے بعد تدریس کی پیش کش کی تھی، یہ پیش کش ہی ان کے علم پر اعتماد کا مظہر تھا، لیکن والدین کی خدمت اور ان سے دوری کی وجہ سے ادب کے ساتھ جد محترم نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت ظاہر کردی، یہ تو ضرور ہوا کہ علمی مرکز سے دوری کی وجہ سے دادا کو علمی دنیا میں شہرت نصیب نہیں ہوئی، لیکن والدین کی محبت اور خدمت کا ہی فیضان تھا کہ ان کو اللہ نے حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جیسا فقیہ فرزند عطا کیا اور میرا یہ احساس ہے کہ دین کی جو بھی خدمت مجھ سے بن آئی ہے، اس میں میرے والد کے ساتھ میرے دادا کی باطنی توجہات کا بھی اثر ہے۔

تصنیفات

حضرت شیخ الہند کو تدریس اور تحریکی مصروفیات کی وجہ سے تصنیف وتالیف کا موقع کم ملا، اس کے باوجود آپ کی تصنیفات متنوع فنون میں ہیں اور ہر تصنیف اپنے آپ میں اہل علم کیلئے بیش قیمت سرمایہ ہے، حضرت شیخ الہند کی تصنیفات، قرآنیات، حدیث، فقہ واصول فقہ، معانی وبیان پر محیط ہے، حضرت شیخ الہندؒ

ان اکابر مصنفین میں سے تھے جو ایک لفظ بھی زائد استعمال نہیں کرتے ہیں، لہٰذا ان کی تحریر کا ہر لفظ دعوت غور وفکر دیتا ہے اور اس میں غور وفکر سے نئے معانی کھلتے ہیں۔

◻ ادلۂ کاملہ

یہ آپ کی نو جوانی کی تصنیف ہے، پس منظر یہ ہے کہ مشہور اہل حدیث عالم مولانا احمد حسین بٹالوی صاحبؒ نے ایک اشتہار شائع کیا، جس میں احناف کو دس مسائل صحیح حدیث سے ثابت کرنے کا چیلنج دیا اور فی مسئلہ ثابت ہونے پر دس روپے کے انعام کا بھی اعلان رکھا، جن مسائل پر چیلنج کیا گیا تھا، وہ وہی مشہور مسائل رفع یدین، آمین بالجہر اور اسی جیسے تھے، یہ تحدی حضرت نانوتویؒ کو بھی بہت بری معلوم ہوئی اور جواب نہ دینے کی صورت میں فقہ حنفی سے بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، حضرت نانوتوی کی ایماء پر آپ نے اس اشتہار کا جواب لکھا، حضرت شیخ الہندؒ نے ہر مسئلہ کا جواب بھی لکھا ہے اور آخر میں خود اہل حدیث حضرات کے مسلک پر گیارہ الزامی سوال قائم کیے ہیں، حضرت نانوتوی نے آپ کی اس تصنیف کو پسند فرمایا اور اس کی طباعت کا حکم دیا۔

◻ اِیضاحُ الادلۃ

آپ ادلہ کاملہ کے بعد منتظر تھے کہ مولانا احمد حسین بٹالوی جواب دیں گے؛ لیکن ان کی جگہ کسی سید محمد احسن امروہوی نے مصباح الادلہ کے نام سے اس کا جواب لکھا، مولانا احمد حسین بٹالوی نے اسی کو اپنا جواب قرار دیا، آپ نے حضرت نانوتوی کے حکم سے پھر قلم اٹھایا اور اس کتاب میں ماقبل کتاب کے مضامین کی مزید تشریح کی، مجیب کی بدفہمی کو نمایاں کیا اور ان کے جواب میں جو علمی غلطیاں تھیں اس کو واضح کیا، احادیث کی تشریح میں آپ نے خداداد فقاہت کا جوہر دکھایا ہے اور ایسے معارف اور نکات بیان کیے ہیں جو محض عطیہ الٰہی ہیں، یہ کتاب ۱۲۹۹ھ میں طبع ہوئی، آپ کے شاگرد حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا کے علوم وکمالات کیلئے اگر بالفرض دنیا میں کوئی بھی ثبوت اور کوئی بھی یادگار نہ ہوتی تو یہی کتاب کافی تھی۔[۱]

◻ احسن القریٰ فی توضیح اوثق العریٰ

آپ کی یہ تالیف نماز جمعہ کے تعلق سے احناف کے موقف کی تائید میں لکھی گئی ہے، اس کا پس منظر

(۱) حیات شیخ الہند، ص:۱۵۹

یہ ہوا کہ اہل حدیث حضرات میں سے کسی نے گاؤں دیہات میں جمعہ کی نماز کے تعلق سے لکھ دیا کہ دو آدمی مل کر بھی جمعہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں، اورکسی دستخط کرنے والے نے حنفیہ کے موقف کو ہوس من ہوسات الشیطان قرار دیا، یہ فتوی جب گنگوہ پہنچا تو حضرت گنگوہی نے احناف کے موقف کی مدلل تائیدفرمائی، حضرت گنگوہی کا یہ فتوی اوثق العری کے نام سے طبع ہوکر شائع ہوا، اس پر مولوی محمد سعید بنارسی نے مستقل اور مولانا محمد علی اعظم گڑھی نے ایک دوسرے رسالہ کے ضمن میں اوثق العری پر اعتراضات کیے، ان دونوں رسالوں میں احناف کی نسبت سخت الفاظ استعمال کیے گئے، ان دونوں کے جواب میں حضرت شیخ الہند نے قلم اٹھایا اور حضرت گنگوہی کے اس رسالہ کی شرح وتوضیح کی اور مفہوم کو واضح کیا، احسن القریٰ کی زبان نہایت سلیس اور شگفتہ ہے اور جگہ جگہ اشعار کا استعمال ہے جس سے مخاطب پر تعریف اور تہذیب کے دائرہ میں چوٹ کی گئی ہے، یہ پوری کتاب آپ نے حضرت گنگوہی کو سنائی، حضرت گنگوہی کو آپ کی یہ کتاب بہت پسند آئی، اور آپ کی تحقیقات کی داد دی اور حضرت گنگوہی کے خادم خاص حضرت مولانا یحیی کاندھلوی کے مطبع سے شائع ہوئی۔

❑ جهد المقل في تنزيه المعز والمذل

یہ کتاب دراصل حضرت شاہ اسماعیل شہید پر امکان کذب کے الزام کے دفاع میں لکھی گئی ہے، ایک مشہور عالم نے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ پر پہلے تو امکان کذب کا الزام لگایا، پھر اس کے ابطال کے درپے ہوکر ایک کتاب لکھی، اس کے جواب میں حضرت شیخ الہند نے یہ کتاب لکھی، چونکہ یہ کتاب کلامی مسائل پر مشتمل ہے، اس کتاب پر تقریظ لکھنے والوں نے اکابر دین کی نسبت زبان کی حفاظت نہیں کی، حضرت شیخ الہند نے اس موقع پر جو بات کہی، وہ نہایت قابل قدر ہے، فرمایا:

> ان گستاخ لوگوں کو برا کہنے سے تو اکابر کا انتقام نہیں لیا جاسکتا، اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دل کو ٹھنڈا کیا جائے تو وہ لوگ معذور و بے قصور ہیں۔

آپ نے اس کتاب میں علم کلام کے بہت سارے مسائل کو واضح فرمایا ہے، بالخصوص کلام نفسی کی ایسی تشریح فرمائی ہے جس سے دل مطمئن ہوجاتا ہے، یہ کتاب اہل علم کیلئے خاص تحفہ ہے۔

❑ اِفاداتِ محمود

یہ حضرت شیخ الہند کے دو مضامین عظمت وحی اور حدیث لا ایمان لمن لا امانۃ لہ کی تشریح پر مشتمل ہے

جو پہلے پہل القاسم میں شائع ہوئے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے ان مضامین کی اہمیت کے پیش نظر اس کو مستقل کتاب کی صورت میں ۱۳۵۲ھ میں شائع کرایا۔

❑ حاشیہ مختصر المعانی

یہ مطبع مجتبائی کے مالک کی خواہش پر لکھا گیا تھا، حاشیہ کی عبارت نہایت سلیس اور رواں ہے اور عربی طلبہ کیلئے بہت کارآمد ہے۔ ۱۳۴۴ میں شائع ہوئی اور اس کے بعد سے مسلسل شائع ہو رہی ہے۔

❑ کلیاتِ شیخ الہند

یہ آپ کے منظوم کلام کا مجموعہ ہے جس میں اساتذہ ومشائخ کی وفات پر درددل کا اظہار ہے تو خوشی کے مواقع پر اپنے جذبات کا بیان ہے، اور اسی طرح دیگر اصناف سخن میں بھی آپ نے اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے، یہ کتاب صرف ایک بار شائع ہوئی، اب نایاب ہے۔

❑ تصحیح ابوداوٗد

حضرت شیخ الہند نے برسوں ابوداوٗد شریف کا درس دیا تھا، برسوں کی تدریس اور حدیث پاک کی اس اہم کتاب کے گہرے مطالعہ کے بعد اپ کو محسوس ہوا کہ ابوداوٗد شریف کا جو متن ہندوستان سے شائع ہورہا ہے، اس میں کتابت کی غلطیاں اور عبارت میں اختلافات ہیں، اس بناء پر آپ نے شاگردوں کو لے کر متعدد نسخوں کا پہلے تو مقارنہ کیا پھر ایک درست متن تیار کیا، آج ہندوستانی مکتبات میں ابوداوٗ شریف کا جو نسخہ دستیاب ہے، وہ حضرت شیخ الہند کا ہی تصحیح کردہ ہے۔

❑ الابواب والتراجم

بخاری شریف کے ابواب وتراجم کا موضوع ہمیشہ سے اہل علم ومحدثین کیلئے مشکل رہا ہے، کیونکہ امام بخاری سے اس سلسلے میں کوئی اصول تحریری یا زبانی منقول نہیں ہے، ایسے میں امام بخاری کے تراجم کو سمجھنے کیلئے پورے بخاری شریف کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے، اہل علم نے ہمیشہ سے اپنے علم اور مطالعہ کی بنیاد پر ان ابواب وتراجم کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی حضرت شیخ الہند کا ''الابواب والتراجم'' ہے، جس میں آپ نے بخاری شریف کے اپنے چالیس سالہ تدریس اور حدیث کے گہرے مطالعہ کا نچوڑ اور خلاصہ پیش کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ متقدمین نے علم کے میدان میں

متاخرین کیلئے کتنی وسیع جگہ چھوڑی ہے، اس کتاب کی تصنیف مالٹا میں شروع ہوئی تھی اور رہائی کے بعد امید تھی کہ اس کی تکمیل ہوگی لیکن قضا وقدر نے اس کی مہلت نہیں دی، اس کے باوجود کہ یہ کتاب نامکمل ہے، اپنے نکات ومعارف کے لحاظ سے بقول حضرت مولانا حسین احمد مدنی اگر چودھویں کا چاند نہیں تو دسویں کا چاند ضرور ہے۔

□ ترجمہ وتفسیر قرآن پاک

یہ چونکہ حضرت شیخ الہند کا سب سے اہم علمی کارنامہ ہے اس لیے اس کے متعلق تھوڑی تفصیل سے لکھا جاتا ہے، حضرت مولانا عبدالرحیم رائے پوری اور دیگر اہل علم وفضل کا اصرار حضرت شیخ الہندؒ سے تھا کہ وہ قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر اس طرز پر لکھیں جس سے عوام الناس کو استفادہ میں کوئی دشواری نہ ہو، حضرت شیخ الہند اپنی درسی و دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس کو ٹالتے رہے، یہاں تک کہ ۱۳۲۷ھ میں آپ نے ترجمہ قرآن مجید کا آغاز کیا، لیکن مستقل ترجمہ کرنے کے بجائے حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ قرآن کو بنیاد بنایا اور اس میں جو لفظ متروک تھے اس کی جگہ رائج لفظ اور جس لفظ میں اجمال تھا اس کی جگہ ایسا لفظ رکھا جس سے بات واضح ہوجائے، بظاہر یہ آسان کام لگتا ہے لیکن درحقیقت بہت دشوار تھا بلکہ مستقل ترجمہ سے بھی زیادہ دشوار، اس سلسلے میں حضرت شیخ الہند دیوبند میں موجود اپنے اہل علم شاگردوں سے بھی مدد لیتے، سوا تین سال کے عرصہ میں تقریباً دس پارہ تک ترجمہ کا کام ہوا کہ حضرت شیخ الہند کو حجاز جانا پڑا اور وہاں سے انگریزوں نے گرفتار کر کے مالٹا میں قید کردیا، مالٹا میں اسارت کے زمانہ کو حضرت شیخ لہند نے اسی کام کیلئے وقف کیا اور دوران ترجمہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا عزیر گل سے تبادلہ خیال فرماتے رہے، یہ ترجمہ ایک سال میں ۲؍شوال ۱۳۳۶ء میں مکمل ہوگیا، ترجمہ کے بعد حضرت شیخ الہند نے تفسیر کا کام شروع کیا اور اس میں بھی حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے موضح قرآن کو بنیاد بنا کر تفسیر لکھنی شروع کی، سورہ نسا تک تفسیری حواشی لکھے تھے کہ رہائی کا پروانہ ملا، یہ ترجمہ اور تفسیر حضرت شیخ الہند کو اس قدر عزیز تھا کہ ہندوستان آتے ہوئے ایک جگہ جہاز کو طوفان نے گھیر لیا تو مسودہ کو محفوظ کر کے حضرت مولانا عزیر گل کے سینے سے بندھوادیا کیونکہ وہ تیرنا جانتے تھے اور انہیں اس کی اشاعت کی ذمہ داری دی، لیکن بفضلہٖ تعالی جہاز محفوظ رہا۔ اس کی پہلی طباعت ۱۹۲۵ء میں ہوئی، بقیہ ۲۶؍پاروں کے تفسیری حواشی علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے ہیں، اگر کوئی غور سے پڑھے تو اس کو حضرت شیخ الہند اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے حاشیہ میں فرق صاف معلوم ہوگا، یہ نہ صرف زبان میں بلکہ معانی وبیان میں بھی ہے۔

حضرت شیخ الہند کا جذبہ فروتنی اور تواضع جس قدر بڑھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی قدر بلند فرمایا، ترجمہ

قرآن میں بھی انہوں نے اپنے کام اورنام کی جگہ حضرت شاہ عبدالقادر کے نام کو چمکانا چاہا، اللہ تعالیٰ نے اس تواضع کا صلہ یہ دیا کہ پوری دنیا میں یہی ترجمہ مشہور ہوگیا، ہندوستان کے علاوہ پاکستان افغانستان اور دیگر ملکوں نے بھی اسی ترجمہ کو اپنے ممالک میں جگہ دی اور اہل علم نے اسی ترجمہ کو سرمہ چشم بنایا۔

یہاں ایک چیز واضح رہنی چاہئے کہ مالک اخبار مدینہ جو ایک زمانہ میں نہایت مشہور مطبع اوراخبار تھا، اس کے مالک کی خواہش تھی کہ بقیہ تفسیری حواشی حضرت مولانا حسین احمد مدنی لکھیں؛ لیکن اپنی درسی اور سیاسی مصروفیات کی وجہ سے اس کے لئے وقت نہ نکال سکے ،تو پھر ان کی نشان دہی پر حضرت مولانا عبدالرحمن امروہوی کو یہ ذمہ داری دی گئی ،لیکن بعض رکاوٹوں کی وجہ سے انہوں نے بھی ایک دو پارے لکھ کر خود کو اس سے الگ کرلیا، بالآخر قرعہ فال حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے نام نکلا اورانہوں نے اس عظیم کام کی نہایت عمدگی کے ساتھ تکمیل کی۔

دیوبند اور علی گڑھ کو قریب لانے کی کوشش

حضرت شیخ الہند کا قوی احساس تھا کہ تعلیم کی دوئی کی وجہ سے عصری تعلیم یافتہ اور دینی تعلیم یافتہ لوگوں میں جو دوری پیدا ہورہی ہے، وہ ملت کے حق میں نہایت مہلک ہے، اگر دین کو ایک شخص فرض کیا جائے تو امت کا ہر طبقہ اس کا کوئی نہ کوئی اہم عضو ہے، ایک عضو دوسرے سے نفرت کرے، دور ہوجائے تو پھر وہ جسم کیسے کام کرسکتا ہے؟ اس لیے آپ کی برابر کوشش رہی کہ دونوں کو قریب کیا جائے اور جو غلط فہمیاں حائل ہیں، ان کو دور کیا جائے، حضرت شیخ الہند کا یہ کام بھی اپنے شیخ واستاذ حضرت نانوتوی کی خواہش کو ہی عملی جامہ پہنانا تھا، حضرت نانوتویؒ چاہتے تھے کہ دینی تعلیم یافتہ حضرات اگر عصری تعلیم بھی حاصل کریں تو یہ ان کیلئے زیادہ بہتر اور مفید ہوگا۔

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی ذات جامع تھی عقل اورنقل کو، دارالعلوم دیوبند نے نقلیات کے جز کو لیا اور علی گڑھ نے عقلیات کے جز کو لیا، کیونکہ حضرت نانوتوی اور سرسید دونوں شاگرد ہیں مولانا مملوک علیؒ کے، اوران کا سلسلہ تلمذ بیک واسطہ حضرت شاہ صاحب تک پہنچتا ہے؛ لیکن عقل اگر نقل کے تابع یا اس کی رہنمائی نہ چلے تو گمراہی کا اندیشہ ہے، اور بالآخر یہی ہوا بھی کہ خود سرسید اور علی گڑھ کے طلبہ میں الحاد، نیچریت وغیرہ عام ہوگئی، دین کی مسلمہ باتوں کی بھی تاویل ہونے لگی، حضرت شیخ الہند اس خلیج کو پاٹنا چاہتے تھے ،اس کام کی ابتدا تو حضرت نانوتویؒ نے ہی کردی تھی، ان کے داماد علی گڑھ میں

دینیات کے شعبہ کے استاذ تھے، حضرت شیخ الہند نے علی گڑھ کی جانب ہاتھ بڑھایا تو علی گڑھ نے پوری محبت اور عقیدت سے اس کا خیر مقدم کیا۔

حضرت شیخ الہند کے اس قدم پر بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا لیکن آپ نے اس کی پرواہ نہیں کی، حضرت کو رہائی کے بعد زیادہ مہلت نہیں ملی کہ اس سلسلے میں کوئی کام کر سکتے، جب حضرت مولانا حسین احمد مدنی علی گڑھ یونیورسٹی تشریف لے گئے تو وہاں کے ناظم دینیات مولانا ابوبکر شیث صاحب نے کہا کہ

> آپ ان بچوں کے قریب تو آئیں، یہ آپ کا دامن پکڑ لیں گے تو چھوڑیں گے نہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں وہ مشہور خطاب ہوا جو'الانتباہات المفیدہ' کی تصنیف کا سبب بنا،علی گڑھ نے بھی دیو بند کے بعض بزرگوں کو اپنے کورٹ کا ممبر بنایا اور انتظامی وعلمی امور میں ان کی رہنمائی سے کام کیا؛لیکن اس خلیج کو سب سے زیادہ پر کیا حضرت مولانا یوسف کاندھلویؒ نے، انہوں نے اس خلیج کے نقصان کو سمجھا اور اس کو پاٹنے کیلئے اپنی تبلیغی تحریک کا پورا زور لگایا، اس کا ہی نتیجہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی جہاں کبھی کمیونزم، اشتراکیت اور اللہ اور اس کے رسول سے بے زاری کا اظہار کھلے عام ہوتا تھا، طلبہ اور اساتذہ دین پر عمل کرتے ہوئے شرماتے تھے، اب وہاں دین کا اظہار کھلے عام ہوتا ہے، اور دین بیزاری چوری چھپے اور پردوں میں ہوتی ہے۔

اخلاق و کردار

□ اتباعِ سنت

حضرت شیخ الہند میں اتباع سنت کا مزاج راسخ ہو کر طبیعت ثانیہ بن گیا تھا، رفتار، گفتار، کردار ہر جگہ اتباع سنت پیش نظر رہتا تھا، فرائض وواجبات، سنن اور احکام شرعیہ پر عمل تو ایک طرف رہا، مستحبات پر بھی عمل فرماتے، مالٹا میں جب سنت یوسفی ادا کر رہے تھے تو ذی الحجہ کا مہینہ آ گیا مسافر پر قربانی واجب نہیں ہوتی، قیدی کا تو پوچھنا ہی کیا، لیکن آپ نے اسیری میں بھی اس سنت سے دوری گوارا نہیں کی اور جیل کے افسران سے اصرار کر کے ذبح کی اجازت لی اور اپنے خرچ سے ایک بکری خرید کر ذبح کیا، کسی بھی بڑے شخص کے خادم اپنے مخدوم کے روز وشب اور حالات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ مخدوم کی جلوت کیسی ہے اور خلوت کیسی ہے؟

حضرت شیخ الہند کی خدمت میں شب وروز طویل عرصہ رہنے والے خادمین کا بھی یہی احساس تھا کہ انہوں نے کبھی آپ سے سنت کے خلاف کوئی کام ہوتا نہیں دیکھا، لوگ بزرگوں میں کرامت ڈھونڈتے ہیں کہ وہ ہوا میں اڑتے ہوں، پانی پر چلتے ہوں، جب کہ سب سے بڑی کرامت استقامت اور اتباع سنت ہے اور یہ چیز حضرت شیخ الہندؒ میں بدرجہ اتم موجود تھی، اتباع سنت میں حضرت شیخ الہند کا مزاج جتانے کا نہیں تھا کہ حاضرین کو دکھا کر اور جتا کر اتباع سنت کررہے ہوں؛ بلکہ اتباع سنت بھی اس انداز سے کرتے تھے کہ کسی کو پتہ نہ چلے، لیکن اسی کے ساتھ اپنے اہل تعلق کو اتباع سنت کی مسلسل تلقین وہدایت بھی کرتے رہتے تھے، جیسے حدیث میں ہے کہ بارش کے قطرے کچھ بدن میں لگنے چاہئے اور اس کی وجہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ تازہ تازہ رب کے پاس سے آیا ہے، آپ بارش ختم ہوگئی یا نہیں دیکھنے کے بہانے باہر جاتے اور جسم پر کچھ قطرے بارش کے پڑ جاتے، آپ کے شاگرد، ہم وطن اور حضرت مولانا کی خدمت میں طویل عرصہ رہنے والے حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب آپ کے اتباع سنت کے مزاج کے بارے میں لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا کے اخلاق وعادات وہی تھے جو احادیث صحیحہ میں مروی اور سنن نبویہ سے ثابت ہیں، نور معرفت سے سینہ معمور اور کتاب وسنت کے علوم سے دل اور زبان آباد تھے، دیگر اعضا وجوارح بھی انہیں کے تابع تھے، جو حرکت تھی حکم خداوندی کے موافق اور جو فعل تھا سنت صحیحہ کے مطابق، سنت سنیہ اور اخلاق نبویہ کا نمونہ مجسم اگر حضرت کو کہا جائے تو بجا ہے اور انتہائی درجہ کے متبعین سنت صحابہ کی زندگی کا نقشہ آپ کی حیات کو سمجھا جائے تو زیبا ہے۔

اتباع سنت کا مزاج اس قدر ترقی پا گیا تھا کہ طبعی مرغوبات بھی اتباع سنت کے سانچے میں ڈھل گئے، حدیث میں سرکہ کی تعریف بیان کی گئی ہے تو آپ کو سرکہ گھی سے زیادہ محبوب تھا، بعض اوقات ڈاکٹروں نے سرکہ سے منع کیا، اس کے باوجود سرکہ تھوڑا بہت کھاتے رہے، گوشت کو آپ ﷺ نے بہترین کھانا فرمایا ہے تو گوشت بہت مرغوب تھا، جوانی میں خود شکار کرتے تھے، رسول اکرم ﷺ نے سفر شام میں پنیر کھایا تھا، یہ بھی آپ کی پسندیدہ غذا میں شامل تھا، شاید اسی اتباع سنت کا نتیجہ تھا کہ اولاد میں بھی آپ ﷺ کی اتباع نصیب ہوئی، ایک بیٹا اور کئی بیٹیاں کم عمری میں انتقال کر گئیں، چار بیٹیاں بڑی ہوئیں، جن کی شادی ہوئی اور جن سے آپ کا خاندان آگے بڑھا۔

□ اساتذہ ومشائخ کا ادب واحترام اورخدمت

حضرت شیخ الہند کی زندگی کا نمایاں وصف آپ کا اساتذہ اور بزرگوں کا ادب واحترام تھا، اپنے استاذ، شیخ اوران سے تعلق رکھنے والوں کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ آپ کے خاص استاذ تھے، ان کا نہایت ادب فرماتے، درس میں ان کے معارف ونکات کا تذکرہ کرتے، جب کبھی ان کا ذکر آتا تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اوران کا تذکرہ ہوتا تو بشاشت اورفرحت کے آثار چہرے پر نمایاں ہوتے، حضرت نانوتویؒ جب حج سے واپس آرہے تھے، ان کی طبیعت ناساز ہوگئی، جہاز پر جگہ کم تھی، آدمی زیادہ تھے، دوسرے جہاز میں وبا پھیل چکی تھی، روزانہ دوتین افراد لقمۂ اجل ہورہے تھے، ایسے پرآشوب حالات میں بھی آپ نے استاذ کی خدمت نہایت جانفشانی اورمحبت وعقیدت سے کی اوران کوراحت پہنچانے کی ہرممکن کوشش کی، ایک بار برسات کے زمانہ میں حضرت نانوتوی نے نانوتہ سے دیوبند جانے کا قصد کیا، ابھی بیماری سے اٹھے ہی تھے، سڑک خام اور پانی سے بھری ہوئی، اوراسی کے ساتھ بونداباندی بھی ہورہی تھی، حضرت شیخ الہند نے اونچا تہمد باندھا، ایک ہاتھ سے استاد کے سرپر چھتری کا سایہ کیا اورگھوڑے کی رکاب سے بالکل متصل ہوکر دوسرا کمر میں ہاتھ ڈال کرسہارا لگایا، چودہ میل اسی طرح چلے، راستہ میں ایک دوجگہ رکے بھی تو اپنے تھکنے کی بناء پر نہیں؛ بلکہ حضرت نانوتوی کی راحت وآرام کا خیال غالب تھا کہ مسلسل سفر سے کہیں طبیعت کورنج نہ ہو۔

ہرجمعرات کو پیدل عصر سے پہلے گنگوہ کیلئے نکلتے اورشب کوکسی وقت گنگوہ پہنچ جاتے، اور جمعہ کا پورا دن حضرت گنگوہی کی خدمت میں گزار کر وہاں سے نماز جمعہ کے بعد دیوبند کیلئے پیدل روانہ ہوتے، اورشب کوکسی وقت دیوبند پہنچ جاتے، دیوبند پہنچ کر پھر سے اپنے مطالعہ اوردرس کی تیاری میں لگ جاتے، نہ کبھی تھکن کی شکایت کرتے اورنہ کبھی اس کیلئے رخصت لیتے، حضرت مولانا کواللہ نے مالی لحاظ سے خوشحال بنایا تھا، آپ اگر چاہتے توجودوسری سواریاں اس دور میں دستیاب تھیں، اس پر گنگوہ جاسکتے تھے لیکن محض حضرت گنگوہی کے ادب کی بناء پر پیدل گنگوہ تک جاتے اورآتے تھے اوریہ ایک دن کا معمول نہیں؛ بلکہ حضرت گنگوہی کی وفات تک یہی معمول تھا۔

□ تواضع وعاجزی

حضرت شیخ الہندؒ بقول مولانا سید اصغرحسین صاحب حضرت نانوتوی کا عکس جمیل تھے، ان میں بھی کثیرعلم کے ساتھ بے حدتواضع تھا، عاجزی اورفروتنی حد سے زیادہ تھی، ایک مرتبہ آپ کے فرط انکسار پر آپ کے کچھ محبین کبیدہ خاطر ہوئے توآپ نے فرمایا:

میں تو یہ چاہتا ہوں کہ مجھ کو جوتیاں پڑیں اور میں اف تک نہ کہوں۔

ایک دفعہ حضرت شیخ الہندؒ نے طلبہ سے فرمایا: کل تالاب سے مسجد کیلئے کسیر اکھاڑ کرلانا ہے، چنانچہ اگلے دن صبح کو چار طلبہ کو ہمراہ لے کر چل دیئے، تالاب پر پہنچے اور پانچ گٹھریاں باندھیں، چار طلبہ کیلئے اور ایک اپنے لیے، طلبہ کے ساتھ سر پر کسیر کی گٹھری رکھ کرلائے اور مسجد میں لاکر بچھادی۔ (۱)

رمضان المبارک میں تراویح کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نوافل میں حفاظ کرام سے کئی پارے سنتے تھے، ایک بار پاؤں کا ورم بہت زیادہ ہوگیا، مگر نماز سے جو محبت اور عشق تھا، وہ اس حال میں بھی قرآن مجید سننے کو بے قرار کرتا تھا، گھر کی عورتوں نے حافظ صاحب کہلا بھیجا کہ آج کسی بہانہ سے قلیل مقدار تلاوت کر کے بس کردینا، حافظ صاحب نے ایسا ہی کیا اور حضرت شیخ الہند سے طبیعت کے کسل اور گرانی کا عذر کیا، حضرت شیخ الہند کو دوسروں کی آرام وراحت رسانی کا بڑا خیال رہتا تھا، اس لیے منظور فرمالیا، حافظ صاحب لیٹ گئے، تھوڑی دیر کے بعد ان کو احساس ہوا کہ کوئی ان کے پاؤں دبا رہا ہے، اٹھ کر دیکھا تو پایا کہ حضرت شیخ الہند ہیں، ان کو بڑی حیرت اور اس سے زیادہ ندامت دامن گیر ہوئی، حضرت شیخ الہند فرمانے لگے: نہیں بھائی! کیا حرج ہے، تمہاری طبیعت اچھی نہیں، ذرا راحت آجائے گی۔

ایسا بھی متعدد بار ہوا ہے کہ کئی اہل کمال آپ کی شہرت سن کر آپ سے ملنے آئے، آپ کی سادہ وضع قطع کی وجہ سے آپ کو پہچان نہ سکے، آپ نے ان کیلئے پانی لایا، کھانا لایا، اور جو بھی خدمت بن پڑسکتی تھی وہ کی اور آخر میں فرمایا کہ میں ہی محمود حسن ہوں، اس وقت مہمان کی حیرت بلکہ ندامت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا تھا کہ جس کو مخدوم سمجھ کر ہم آئے تھے اور جس کی خدمت کرنے کی تمنا تھی، وہ ہمارا خادم بن کر ہماری خدمت کر رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کا تعلق اگر اللہ سے ہو، تو اس سے خلوص، تواضع، فروتنی اور عاجزی پیدا ہوتی ہے، لیکن اگر علم کا تعلق نفس سے ہو، نفسانیت سے ہو، دنیا پر اپنے علم کا رنگ اور رعب جمانے کیلئے تو اس سے کبر اور ریا پیدا ہوتا ہے جس سے انسان خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور ہزاروں کی گمراہی کا ذریعہ ہوتا ہے، مولانا روم اسی بات کو صدیوں پہلے کہہ گئے ہیں:

علم رابردل زنی یارے بود　　　علم رابرتن زنی مارے بود

(۱) تذکرہ حضرت شیخ الہند، ص: ۱۲۴

آپ کے اسی تواضع اور انکسار کا نتیجہ تھا کہ آپ اپنے سے عمر اور علم وفضل میں بہت کم تر لوگوں کے ساتھ بلکہ ان کی ماتحتی میں بھی کام کرنے کیلئے تیار رہتے تھے، مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جب حزب اللہ نامی جماعت تیار کی اور اس کے تحت امیر الہند بننے کا ارادہ کیا تو باوجود اس کے کہ حضرت شیخ الہند سے وہ عمر اور علم وفضل اور علمی دنیا میں شہرت اور باکمال شاگردوں کی تعداد میں کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود حضرت شیخ الہند ان کو امیر الہند بنانے اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے پر تیار تھے، اسی طرح مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں بھی کام کرنے میں آپ کو کوئی عار نہیں تھا؛ حالانکہ وہ آپ سے عمر میں بہت کم اور علم وفضل میں تو اور کم تھے لیکن یہ حضرت شیخ الہند کی تواضع تھی کہ آپ ہر ایک کے ساتھ کام کرنے کیلئے تیار رہتے تھے۔

❑ عبادت وریاضت

حضرت مولانا کی فطرت میں ابتدا سے ہی عبادت کا شوق تھا، عام بچوں کی طرح کھیل کود کے رسیا نہیں تھے، البتہ شکار کا شوق تھا اور وہ ایک درجہ میں محمود بھی ہے کہ اس سے جفاکشی اور محنت ومشقت کی عادت پڑتی ہے، جب حضرت نانوتوی کے پاس رہ کر حدیث پڑھتے تھے تو دن کو تعلیم وتعلم کا شغل رہتا اور رات کو مطالعہ اور عبادت ووظائف میں صرف کرتے، جب دارالعلوم دیوبند میں تدریس کی ذمہ داری متعلق ہوئی تو دن کو درس دیتے اور رات کو دو بجے بیدار ہوجاتے اور تہجد وغیرہ سے فارغ ہوکر نوافل میں مشغول رہتے اور لمبے قیام اور رکوع وسجود کرتے، وقت ملتا تو ذکر خفی میں مشغول ہوجاتے، کبھی آرام بھی کرتے اور نئے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتے، رمضان میں تو اپنے کو ہر مشغلہ سے یکسو کرکے صرف عبادت کیلئے خاص کرلیتے اور یہ خاص عبادت صرف تلاوت اور نماز کی ہوتی، رمضان میں فرائض پڑھ کر گھر پر تراویح پڑھتے اور حفاظ سے کئی کئی پارے سماعت فرماتے کبھی کبھی تو دس پارے بھی ہوجاتے، جب اس طویل قیام سے پاؤں پر ورم پڑ جاتا تو خوش ہوتے کہ آج اتباع سنت کی توفیق نصیب ہوئی، قرآن مجید کی تلاوت سن کر بے قرار ہوجاتے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے لیکن زبان سے کسی طرح کی بے قراری کا اظہار نہیں ہوتا تھا، جب مالٹا کی جیل میں قید تھے، باوجود اس کے وہاں سخت سردی تھی، اور حضرت کو جوڑوں کے درد کا عارضہ لاحق تھا، اس کے باوجود آپ نے تہجد سمیت کسی بھی معمول میں ناغہ نہیں کیا؛ بلکہ ہر عبادت کو اسی طرح ادا کرتے رہے جیسے دیوبند میں کرتے تھے۔

تحریک کے ابتدائی اقدامات

حضرت شیخ الہند کی تعلیم وتربیت، ذہن سازی میں بڑا حصہ حضرت نانوتویؒ کا ہے، حضرت نانوتویؒ

نے بذات خود انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑی تھی، حضرت شیخ الہند نے بچپن میں ۱۸۵۷ء کے مرکز سے انگریزوں کے خلاف بغاوت دیکھی تھی، اس بغاوت کو کچلنے کے بعد انگریزوں کا انتقام دیکھا تھا، جس کا زیادہ نشانہ مسلمان ہی بنے، ان کو معاشی اعتبار سے تباہ کر دیا گیا، ان حالات نے اس عہد کے اکابر حضرات کے دل ودماغ میں انگریزوں کے خلاف نفرت بیٹھا دی، بلقان جنگ کے وقت حضرت شیخ الہند کیفیت یہ تھی:

ترکوں کی شکست کی خبر سنتے تو آپ کی ریش مبارک پر آنسو گرتے تھے، راتوں کو دعائیں مانگا کرتے، اگر کوئی دیکھے تو بالکل یہ حالت تھی کہ اگر حضرت کے بس میں ہوتا تو انگریزوں کو کچا چبا ڈالتے، بہر حال پھر بھی جس قدر بس میں تھا، کیا، مدرسہ کی چھٹی کر دی، طلبہ اور مدرسین کو گاؤں گاؤں بھیجا، چندہ کیا، خود اپنی تنخواہ اور تمام ملازمین اور مدرسین کی تنخواہیں چندہ میں دیں، طلبہ نے آپ کے اشارے پر اپنے انعامات اور مطبخ کی خوراک بھی چندہ میں دے ڈالی، اس طرح تقریباً ایک ڈیڑھ لاکھ روپیہ ترکی بھیجا، جس کے صلہ میں ترکی حکومت نے آپ کا شکریہ ادا کیا، اور وہ رومال جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیراہن مبارک رکھا رہتا تھا، دارالعلوم کو بطور تبرک اور عطیہ بھیجا، جو آج بھی دارالعلوم کے خزانے میں تبرکاً موجود ہے۔ (۱)

انگریزوں نے اگرچہ مشرق وسطی اور دنیا کے دیگر ممالک پر قبضہ کیا تھا؛ لیکن اس کا سب سے مضبوط مرکز ہندوستان ہی تھا، یہیں سے اس کو بے پناہ مالی امداد مل رہی تھی جس کی وجہ سے اس کو دیگر مسلم ملکوں پر قبضہ کرنے میں اور برطانیہ کی ترقی میں بڑی مدد مل رہی تھی، شیخ الہندؒ کا منصوبہ تھا کہ انگریزوں کو اس کے سب سے مضبوط مرکز سے بے دخل کر دیا جائے، اس کیلئے آپ کے پاس واضح منصوبہ تھا، آپ نے حضرت نانوتوی کے ساتھ کام کیا تھا، ان کے مزاج اور مذاق کو سمجھا تھا اور دیوبند کے قیام کے مقصد کو بھی سمجھا تھا کہ وہ محض ایک درسگاہ نہیں بلکہ افراد سازی کا ادارہ ہے، اور یہی بات حضرت شیخ الہند نے مولانا مناظر احسن گیلانی سے فرمایا جب ان کو حضرت شیخ الہند کے مقاصد معلوم کرنے کیلئے ادارہ کے ذمہ داروں نے بھیجا تھا، حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا:

حضرۃ الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس وتدریس، تعلیم وتعلم کیلئے قائم کیا تھا،

---

(۱) تذکرہ حضرت شیخ الہندؒ ص: ۱۶۳

مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے
کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیراثر
لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔ (۱)

اور ساتھ یہ ہی یہ بھی فرمایا:

فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا، ادا کرتا رہا، اب آخری کام رہ گیا ہے، جسے اپنی
حد تک تو میں کر گزروں گا۔ (۲)

حضرت شیخ الہند انگریزوں کو بے دخل کرنے کیلئے شروع سے اپنے ذہن میں ایک واضح منصوبہ رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے خود کو اتنا جفاکش بنایا تھا کہ چودہ چودہ میل تک اپنے استاذ محترم پر چھاتا لے کر ان کے ساتھ پیدل چلتے ہیں، جمعہ کے دن شکار کیلئے دیوبند سے چھ سات میل دور نکل جاتے تھے، پھر جمعہ کی نماز کیلئے دوڑتے ہوئے آتے، جامع مسجد میں نماز پڑھتے، پھر اسی طرح دوڑتے ہوئے شکار کے مقام پر واپس پہنچ جاتے، دیوبند سے گنگوہ کا راستہ ہر جمعرات کو پاپیادہ طے کرتے اور پھر پیدل ہی واپس آتے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے وسط ایشیا کے طلبہ کیلئے دارالعلوم دیوبند کو ایک مرکز بنایا، جہاں افغانستان اور اس سے قرب وجوار کے علاقوں کے طلبہ دیوبند میں آتے اور حضرت شیخ سے پڑھتے، حضرت شیخ نے بعد میں اسی علاقے کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا، یہ بتاتا ہے کہ حضرت شیخ الہند کے ذہن میں ابتدائے درس وتدریس سے ہی ایک واضح منصوبہ تھا جس کی تکمیل کا وقت چالیس پچاس برسوں کے بعد آیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے دارالعلوم دیوبند میں افراد کار کی تیار کیلئے ۱۲۹۷ھ میں ثمرۃ التربیت نامی انجمن قائم کی، پھر اسی ثمرۃ التربیت کا نام بدل کر ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں جمعیۃ الانصار رکھا، اور اس کی ذمہ داری حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کو دی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کی خواہش کے مطابق تندہی سے کام کیا؛ اس انجمن کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں بھی ایک ایسا گروہ تیار کیا جائے کہ جب باہر سے انگریزوں پر حملہ ہو تو یہ اندر کے لوگ انگریزوں کے خلاف بغاوت کردیں اور یوں انقلاب کی راہ آسان ہوجائے اور پھر یہی تربیت یافتہ لوگ ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں، چار سال دیوبند میں یہ جمعیۃ کام کرتی رہی، پھر جب دارالعلوم کے ذمہ داروں کو مولانا سندھی سے کچھ شکایات پیدا ہوئیں تو حضرت شیخ

---

(۱) احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، ص: ۱۷۰ (۲) حوالۂ سابق

الہند نے جمعیۃ الانصار کو دیوبند سے دہلی منتقل کردیا اور اس کا نام بدل کر نظارۃ المعارف رکھا گیا، حضرت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو دیوبند میں رکھ کر جس طرح تحریک کے بڑوں سے ان کو واقف کرایا تھا، اسی طرح دہلی بھیج کر عصری تعلیم یافتہ لوگوں سے واقف کرایا، جن میں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر وغیرہم شامل ہیں۔ ۱۹۱۵ء کو شیخ الہند نے مولانا سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا، اس وقت ان کو کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا؛ لیکن کابل جا کر مولانا سندھی کو اندازہ ہوا کہ حضرت شیخ الہند کے منصوبے کتنے وسیع ہیں اور دیوبند کی چہاردیواری میں رہنے والے درویش کا دماغ کتنا آفاقی اور اس کی تحریک کتنی ہمہ گیر ہے، مولانا سندھی لکھتے ہیں:

> کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ جس جماعت کے نمائندے تھے، اس کی پچاس سال کی محنتوں کا حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کیلئے تیار ہے، اس میں میرے جیسے ایک خادم کی حضرت شیخ الہند کو اشد ضرورت تھی، اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔ (۱)

حضرت شیخ الہند کی تحریک کا بنیادی خاکہ یہ تھا کہ یاغستان اور وسط ایشیا کے مسلمانوں کو دین کی دعوت پر جمع کیا جائے، اس علاقہ کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ یہ انگریزی عمل داری سے دور تھا، یہاں کام کرنا نسبتاً آسان تھا دوسرے یہاں کے نوجوان جفاکش اور طاقتور تھے، تیسرے ان میں ملی حمیت اور غیرت زیادہ تھی، پھر حکومت افغانستان کی فوجی مدد سے ہندوستان پر حملہ کیا جائے لیکن حکومت افغانستان کے پاس فوج تو تھی لیکن ہتھیار اور مالی وسائل نہیں تھے، اس لیے کوشش کی گئی کہ اس کیلئے سلطنت عثمانیہ سے مدد لی جائے، حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقاء نے حجاز میں سلطنت عثمانیہ کے بڑے اراکین سے ملاقات کر کے سلطنت عثمانیہ سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی، دوسری طرف کابل میں مولانا سندھی نے وہاں مقیم تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی جماعت کو لے کر جس میں ہندو، مسلم سکھ سبھی شامل تھے جلاوطن حکومت قائم کی،، جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ، وزیراعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی، وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی و دیگر تھے، اس جلاوطن حکومت کے وفود نے چین میں، برما میں، فرانس میں، امریکہ میں، جرمنی وغیرہ کی حکومتوں سے بات کی، وہاں کی اشرافیہ سے ملاقات کر کے ان کو اپنے مشن سے آگاہ کیا اور اس کیلئے مدد چاہی، غیر ملکی حکومتوں میں سے جرمنی سے

---

(۱) تذکرہ، ص: ۱۷۷

زیادہ توقع تھی ایک تو وہ ترکی کا حلیف تھا، دوسرے اس کی برطانیہ سے پرانی مخاصمت تھی، بیرونی محاذ پر حضرت شیخ الہند کو بڑی کامیابی نصیب ہوئی، افغانستان حملہ کیلئے راضی ہوگیا، ترکی نے بھی مالی اور فوجی مدد دینے پر آمادگی ظاہر کر دی اور ترکی کے ساتھ جرمنی بھی اس اتحاد میں شامل ہوگیا۔

دوسری طرف ہندوستان میں بڑی تعداد میں افراد تیار کیے گئے کہ جب بیرونی حملہ ہوتو وہ اندر سے بغاوت کر دیں، انگریزی حکومت کیلئے دو محاذوں پر لڑنا مشکل ہوجائے گا اور ہندوستان سے انگریزی حکومت ختم ہوجائے گی، اس تحریک کو مضبوطی دینے کیلئے اور دو کام کیے گئے، اولاتو تحریک کے پختہ کارکارکنان کو سی آئی ڈی اور پولیس میں بھرتی کیا گیا تا کہ اندر کی خبریں معلوم ہوتی رہیں، دوسری جانب قابل لحاظ تعداد میں کارکنان کو فوج میں بھرتی کیا گیا جس کے ذمہ تحریک کے تعلق سے فوجیوں میں ہمدردی اور انگریزی حکومت سے نفرت پیدا کرنا تھا۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر جو انگریزی اخبار کامریڈ کے مدیر تھے اور سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ امریکہ ہماری مدد کرے گا، یا غیر جانبدار رہے گا، جب کہ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ امریکہ مدد اور غیر جانبداری تو دور کی بات ہے وہ انگریزوں کا حلیف بن جائے گا اور جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ حضرت شیخ الہند نے جو فرمایا تھا وہی ہوا۔

یہ پورا منصوبہ حضرت شیخ الہندؒ کا تھا، حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایات لوگوں تک پہنچانے کیلئے ایک خفیہ نظام قائم کیا گیا، جسے ریشمی رومال کہتے ہیں، اس کی شکل یہ تھی کہ :

> ایک ماہر کاریگر سے ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں معاہدہ کی پوری عبارت اور تاریخ حملہ کی منظوری کی عبارت بھی بُن دی گئی، یہ عبارت عربی زبان میں تھی اور دستخط حبیب اللہ اور اس کے تینوں بیٹوں امان اللہ خان، نصر اللہ خان، عنایت اللہ خان کے ایک دفعہ تو بننے میں آ گئے، پھر اس رومال کے اوپر ان چاروں کے کے دستخط زرد رنگ کی سیاہی سے کروائے گئے، یہ رومال بھی زرد رنگ کا تھا، جس کی لمبائی ایک گز تھی اور عرض بھی اتنا ہی تھا۔

منصوبہ کا راز فاش ہونا

حضرت شیخ الہندؒ جس منصوبہ پر کام کر رہے تھے، وہ قریب التکمیل تھا، ترکی اور جرمنی کی حکومتیں مالی

اورفوجی مدد دینے کیلئے راضی ہوگئی تھیں، افغانستان کی حکومت فوجی مدد فراہم کرنے اورترکی کی فوجوں کوراستہ دینے کیلئے تیار ہوگئی تھی ، ایسے میں اچانک سی آئی ڈی اور پولیس میں آپ کے مخبروں نے خبردی کہ انگریزی حکومت آپ کوگرفتارکرناچاہتی ہے، آپ کیلئے افغانستان اور یاغستان کی راہ آسان نہیں تھی، آپ نے حجاز کا راستہ اختیارکیا تاکہ وہاں موجود سلطنت عثمانیہ کے عمائدین سے فوجی امداد کی براہ راست بات کی جائے اوران سے قابل اعتماد وثیقہ لیاجائے ، ادھر ریشمی رومال کا راز فاش ہوگیا، اس کی وسعت اور ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے انگریزی حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس نے فوری اقدامات کرتے ہوئے انقلابیوں کو افغانستان کی سرزمین سے باہر نکالنے کے اقدامات کیے، حجاز میں اسی زمانہ میں شریف مکہ نے بغاوت کردی، اورایک فتوی کو بہانہ بناکرآپ کو گرفتارکرنے کی کوشش کی گئی، آپ روپوش ہوگئے تومولانا حسین احمد مدنی اورمولانا عزیرگل کوگرفتارکرلیا گیااوراور آپ کا پتہ پوچھا گیااورنہ بتانے کی صورت میں تین دن میں جان سے ماردینے کی دھمکی دی گئی، اس پربھی یہ حضرات ٹس سے مس نہ ہوئے، لیکن جب آپ کومعلوم ہواتواحرام باندھ کرآپ باہرتشریف لائے اورشریف مکہ نے گرفتارکرکے برٹش گورنمنٹ کے حوالہ کردیا، ۱۳۳۴ھ کوحضرت شیخ الہند، حکیم نصرت حسین صاحب، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا عزیرگل اور وحید احمد پرمشتمل پانچ نفری قافلہ جدہ سے روانہ ہوا، سوئز وغیرہ میں ٹھہرتے ہوئے ۱۳۳۵ھ کو مالٹالایا گیااوریہیں قید کیا گیا۔

مالٹا کی مشقت

مالٹا میں سردی بہت شدید پڑتی ہے، ابتدا میں جب حضرت شیخ الہند اورآپ کے رفقاء کو لایا گیاتو یہاں خیموں میں رکھا گیا، خیموں میں سردی سے بچنے کا کوئی نظم نہیں تھااورحضرت شیخ الہند کوابتدا سے سردی سے بہت تکلیف ہوتی تھی، یہاں کی شدید سردی نے اس جسمانی اعتبار سے نحیف ونزار شخص پرکس قدر ستم ڈھایا ہوگا صرف اندازہ کیاجاسکتا ہے لیکن اس کوہ وقار وعزیمت نے ان شدائد ومصائب میں بھی اپنے عبادت اوراورادووظائف کے معمولات حسب معمول برقرار رکھے۔

مالٹا کے قید خانے میں

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے پاک نفس کی برکت سے مالٹا کے قید خانہ کوبھی علم ومعرفت کی دکان میں تبدیل کردیا تھا، ترکوں کی بڑی تعداد وہاں قید تھی، وہ سب آپ کے علم وفضل اورتقویٰ وتقدس کے قائل ہوگئے

تھے، بہت سارے ترکوں نے جو وہاں قید تھے، آپ کے دست مبارک پر بیعت کیا، ایک ترک عالم نے آپ سے قرآن کا نسخہ ترجمہ کیلئے لیا اور ترکی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا، مالٹا کی جیل میں حضرت شیخ الہند کے معمولات پر حضرت مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے روشنی ڈالی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے اپنے قلوب کو مزکی اور دل کو قلب سلیم بنا لیا ہے وہ چمن میں رہیں یا قید خانے میں، ہر جگہ ان کیلئے برابر اور یکساں ہوتی ہے کیونکہ خدا کے ذکر کیوجہ سے ان کے قلوب ہمیشہ مطمئن اور فرحاں وشاداں رہتے ہیں، بظاہر حالات کا ان پر اثر نظر آتا ہے لیکن اندر سے وہ ہر قسم کی تشویش اور فکر واضطراب سے آزاد ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی، ان کی گرفتاری تو پہلے طویل عرصہ تک ظاہر نہیں ہوئی، لیکن جب ظاہر ہوئی تو پھر ملک بھر میں ہلچل مچ گئی، جلسے جلوس ہونے لگے، حکومت کو میمورنڈم دیا جانے لگا، کونسلوں میں سوال پوچھے جانے لگے، حکومت ہند نے کبھی تو کہا کہ ان کی گرفتاری جدہ سے ہوئی ہے، حکومت ہند کا کوئی ہاتھ نہیں، کبھی غیر مما لک سے فوجی ساز باز کا الزام لگایا گیا، حکومت پر دباؤ بڑھتا گیا اور حکومت بھی مطمئن ہوگئی کہ جو تحریک چلائی گئی، اس کو بے اثر کیا جا چکا ہے تو عوامی شورش سے کیا فائدہ؟ حکومت نے آپ کو آپ کے رفقاء کے ساتھ رہا کر دیا، ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۴ جون ۱۹۲۰ء کو آپ دیوبند پہنچے۔

حضرت شیخ الہند کا پیغام

حضرت شیخ الہند نے امت کا زوال اور مغربی استعمار اور سامراج کا مسلم ملکوں میں غاصبانہ تسلط کا بغور مشاہدہ کیا تھا، حرمین تک کی حالت ان سے پوشیدہ نہیں تھی، اس کے اسباب ووجوہ پر آپ مالٹا کے اسارت خانے کی تنہائیوں میں ہمیشہ غور وفکر فرماتے رہے اور اپنے طویل غور وفکر پر ایک نتیجہ پر پہنچ گئے اور وہی ان کو امت کی تمام خرابیوں اور بیماریوں کی جڑ معلوم ہوئی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی جو حضرت شیخ الہند کے آخری دور کے دیکھنے والوں میں ہیں، وہ لکھتے ہیں:

> مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دار العلوم میں تشریف فرما تھے، علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ: ہم نے مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں، یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ آخر اس استاذ

العلماء نے اسی (۸۰) سال [۱] علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں، فرمایا کہ:

میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کی تعلیم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کیلئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کیا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کیلئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔ [۲]

یہ حضرت شیخ الہند کا محض فرمانا نہیں تھا؛ بلکہ آپ نے خود درس قرآن شروع کیا جس میں اکابر علماء کے ساتھ عوام بھی شریک ہوتے تھے، لیکن رہائی کے بعد حضرت کو مہلت ہی بہت مختصر ملی، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

نباض امت مرحومہ نے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اکیلئے سعی پیہم فرمائے، بذات خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علماء شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت علامہ شبیر احمد عثانی جیسے علماء بھی شریک ہوتے تھے، عوام بھی،

---

(۱) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی اسی سالہ تدریس کی بات یا تو کتاب کی غلطی ہے، یا پھر سہو قلم ہے؛ کیونکہ حضرت شیخ الہند کی پوری عمر ہی ستر اکہتر سال کے قریب ہوتی ہے، آپ کی ولادت ۱۸۵۱ء میں ہوئی اور ۱۹۲۰ میں آپ کا انتقال ہوگیا، تدریس ۱۹۹۲ھ سے باضابطہ طور پر شروع ہوتی ہے اور ۱۳۳۳ھ تک آپ نے دیوبند میں درس دیا اور اسی سال حجاز تشریف لے گئے، اگر زمانہ طالب علمی سے بھی آپ کی تدریسی مدت شمار کی جائے یعنی ۱۲۸۹ھ سے، تب بھی تدریس کا دورانیہ ۴۵/سال سے آگے نہیں بڑھتا۔

(۲) وحدت امت، ص: ۴۰

اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے، مگر اس واقعے کے
بعد حضرت کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔ آن قدح بہ شکست وآن ساقی نماند (1)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت نے امت کے مرض کی جو تشخیص فرمائی تھی، وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے، مرض پہلے سے زیادہ بڑھ چکا ہے، اور تشخیص پر عمل کی ضرورت بھی پہلے سے زیادہ ہے، اللہ ہم سب کو حضرت کی وصیت اور نصیحت پر عمل اور قرآن کے پیغام کو عام کرنے اور آپسی اختلافات سے بچنے کی توفیق دے۔

(1) حوالہ سابق

محدث جلیل خطیب بغدادی اور ائمہ احناف سے متعلق ان کا رویہ

مولانا عبید اختر رحمانی ❖

خطیب بغدادی پانچویں صدی ہجری کے محدث ہیں، خطیب بغدادی کثیر التصانیف محدثین میں سے ہیں۔ ان کے حافظہ، علم حدیث، جرح وتعدیل میں مہارت اور رسوخ میں عمومی طور پر تمام محدثین وتذکرہ نگاروں نے تعریف کی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض گوشوں سے ان پر تعصب کا بھی الزام لگایا گیا ہے جس میں بطور خاص ائمہ احناف اور ائمہ احناف میں سے بھی امام ابوحنیفہ کے خلاف تعصب کا الزام لگایا گیا ہے، یہ تعصب کا الزام لگانے والے صرف علماء احناف ہی نہیں؛ بلکہ حنبلی اور کچھ شافعی علماء بھی ہیں۔

خطیب کی مختصر سوانح

خطیب بغدادی ۳۹۲ ہجری میں بغداد میں پیدا ہوئے، ان کے والدان کو شروع سے ہی علماء بالخصوص محدثین کی مجالس میں لے کر جانے لگے۔ خطیب کو بھی علم کا شوق شروع سے ہی تھا لہٰذا انہوں نے علم کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے شہر کے مختلف شیوخ سے استفادہ کیا اور صرف اسی پر بس نہیں کیا؛ بلکہ انہوں نے قریب اور دور دراز کے شہروں اور ملکوں کا بھی کا سفر کیا اور وہاں کے محدثین، فقہاء اور مشائخ سے استفادہ کیا؛ خطیب بغدادی نے علم حدیث اور فقہ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، یہی وجہ ہے کہ ابن خلکانؒ خطیب کے ترجمہ میں لکھتے ہیں کہ وہ فقیہ تھے لیکن ان پر حدیث کا رنگ غالب آ گیا یعنی بطور محدث زیادہ مشہور ہو گئے۔

❖ نگراں شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

كان فقيهاً فغلب عليه الحديث والتاريخ.(۱)

ان کے عہد کا ہی واقعہ ہے جب بغداد پر بساسیریوں کا قبضہ ہوگیا، یہ لوگ مصر کے فاطمی خلیفہ سے زیادہ قریب تھے اور بغداد کے سنی خلیفہ سے عقیدہ میں سخت اختلاف رکھتے تھے۔ خطیب نے اپنے لئے خطرہ محسوس کیا اور بغداد چھوڑ کر دمشق چلے گئے۔ پھر کافی عرصہ بعد وہ واپس بغداد لوٹے اور یہاں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں لگے رہے، سنہ ۴۶۳ ہجری میں آپ کا انتقال ہوا اور حضرت بشر حافی کے پہلو میں دفن کئے گئے۔ (۲)

کیا خطیب حنبلی تھے؟

ابن جوزی نے ''المنتظم فی تاریخ الملوک والامم'' میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی ہے کہ خطیب اولاً حنبلی تھے بعد میں وہ شافعی ہوگئے، اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ بقول بعض حنابلہ وہ اشاعرہ کے ساتھ ربط وضبط رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ حنابلہ ان کے درپے آزار ہوگئے اور انہوں نے شافعی محدثین اور فقہاء سے استفادہ کیلئے زیادہ بہتر یہی سمجھا کہ وہ پورے طور پر شافعی ہوجائیں تاکہ شوافع کی حمایت ان کو ملے؛ کیونکہ حکومت کے دروبست میں بھی اس وقت حنفیوں کے بعد شافعیوں کا ہی زور تھا۔

اس پر رد کرتے ہوئے دکتور محمود الطحان نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ ''الخطیب البغدادی واثرہ فی الحدیث'' میں لکھا ہے کہ خطیب بغدادی کے حنبلی ہونے کی بات غلط ہے، اس کا ذکر صرف ابن جوزی نے کیا ہے، ابن جوزی سے ماقبل کسی بھی مورخ اور ترجمہ نگار نے یہ بات نہیں لکھی ہے؛ بلکہ خطیب بغدادی کے تمام تذکرہ نگاروں نے یہی لکھا ہے کہ وہ شافعی تھے۔ اور انہوں نے شروع سے جن سے علم حاصل کیا ان میں تمام تر فقہاء اور محدثین بھی شوافع ہی ملتے ہیں، اگر وہ حنبلی ہوتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دیگر تذکرہ نگار بھی اس کا ذکر کرتے اور ان کے ابتدائی دور کے اساتذہ میں حنبلی اساتذہ کی کثرت ہوتی لیکن یہ دونوں باتیں ہی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب (۳)

---

(۱) وفیات الاعیان: ۱/ ۹۲

(۲) متعدد کتب تراجم محدثین

(۳) الخطیب البغدادی واثرہ فی الحدیث، ص: ۶۰

تعصب کیا ہے؟

تعصب کا تعلق عصبیت سے ہے اور عصبیت کا تعلق عصبہ سے ہے۔عصبہ والد کی جانب سے رشتہ کو کہا جاتا ہے یعنی دادھیال کو عصبہ کہا جاتا ہے۔دادھیالی رشتہ کو عصبہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب کبھی ضرورت ہوتی ہے تو مدد اور حمایت کیلئے دادھیالی رشتہ دار ہی زیادہ موجود ہوتے ہیں، اسی وجہ سے عصبہ کو مدد اور نصرت کے معنوں میں بھی عربی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اصطلاحی طور پر عصبیت کی تعریف اگر کی جائے تو وہ اس مشہور حدیث کی ضد ہوگی جس میں کہا گیا ہے کہ اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو مظلوم، ظالم کی مدد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دیا جائے:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ:قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: (انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا). قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، هَذَا نَنْصُرُهُ مَظْلُومًا، فَكَيْفَ نَنْصُرُهُ ظَالِمًا؟ قَالَ: تأخذ فوق يديه.(۱)

اسی طرح تعصب میں یہ ہوتا ہے کہ ہم جس فریق کے حامی ہیں ہر حال میں اس کی حمایت اور مدد کی جائے خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر، یہ چیز صرف میدان جنگ اور لڑائی جھگڑے تک محدود نہیں بلکہ علمی دنیا میں کبھی کھلے اور کبھی خفیہ طور پر کسی فریق کی بے جا حمایت اور کسی فریق سے بے وجہ تعصب برتا جاتا ہے۔

یہ ایک اصولی بات ہے کہ ایک شخص کسی علم یا فن میں ماہر ہوسکتا ہے مجتہد ہوسکتا ہے، انتہائی مہارت کا حامل ہوسکتا ہے لیکن یہ اس کو مستلزم نہیں ہے کہ وہ متعصب بھی نہ ہو، اور کسی ایک گروہ، فرقہ یا کسی خاص شخص کے حق میں وہ جانبدار نہ ہو اور اس کی متعدد مثالیں ہمیں محدثین کے تراجم میں ملتی ہیں، کہ وہ کسی خاص شخص یا شہر والوں کے حق میں جانبدار تھے، مثلاً جوزقانی مشہور محدث ہیں؛ لیکن وہ شیعوں کے خلاف انتہائی سخت جذبہ رکھتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ اہل کوفہ میں تشیع تھا لہٰذا کوفی محدثین کے حق میں وہ جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ ہدی الساری میں اس کی تصریح کی ہے، اسی طرح مشہور محدث ابن سعدؒ صاحب طبقات کا حال ہے کہ وہ مدنی ہیں اور کوفیوں سے بطور خاص برگشتہ خاطر ہیں، اسی طرح شیعہ محدث ابن خراش ہیں وہ سنی محدثین کے حق میں انصاف سے کام نہیں لیتے ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۸۶۳، ت البغا

اس کے علاوہ ہم جانتے ہیں کہ امام مالک نے محمد بن اسحاق پر دجال من الدجاجلہ کی جو جرح کی تھی اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی؛ بلکہ صرف ذاتی رنجش تھی، اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ امام نسائی نے احمد بن صالح المصری پر جو جرح کی تھی اس کی بھی کوئی بنیاد نہیں تھی؛ بلکہ یہ صرف ذاتی رنجش تھی، ابن مندہ اورابونعیم کے مابین جولفظی جنگ چلی اس کی بھی کوئی علمی بنیاد نہیں تھی؛ بلکہ صرف مسلکی تعصب تھا،اور یہ صرف ان دونوں کی ہی بات نہیں بلکہ تقریباہر دور میں اس طرح کی بات پیش آئی ہے جہاں معاصرتی حجاب نے نفرت وحسد کی شکل اختیار کی اوراس بنیاد پر دوسرے پر جرح کی گئی۔حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ اس سے کوئی دورخالی نہیں رہا۔ بلکہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگرہم چاہیں تواس پرکراسے یعنی جزء کے جزء تحریر کرسکتے ہیں (۱)۔ابن عبدالبر نے تو جامع بیان العلم وفضلہ میں باقاعدہ اس پرایک باب بھی تحریر کیا ہے جس میں متعدد محدثین کی ایک دوسرے پر جرح نقل کرکے ثابت کیا ہے کہ ان کی جرح معاصرت کی ابتلاء کے سبب ہے اس کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے اسی بناء پران کے اقوال قبول نہیں کئے جائیں گے۔

اہل الرای اوراہل الحدیث کے مابین منافرت

جس طرح سابق میں ہم نے دیکھا کہ محدثین نے مسلکی اورعقیدہ کی بنیاد پر دوسرے پر جرح کی ہے اسی طرح اہل الرای اوراہل الحدیث کے مابین منافرت بھی بہت زیادہ رہی ہے جس کا خود محدثین کو اعتراف رہاہے۔ابن معین ،امام طبری،ابن عبدالبر جیسے اساطین علم وفن نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ محدثین نے اہل الرای حضرات کے ساتھ بسااوقات زیادتی کی ہے اور یہ صرف ان کا ہی نہیں بلکہ انصاف پسند غیر مقلدوں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے،علامہ جمال الدین القاسمی نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بسااوقات محدثین اہل الرای کا ایسا ترجمہ لکھتے ہیں جس کو پڑھ کرآدمی شرمندہ ہوجائے۔اوراس باب میں انہوں نے امام محمداورامام ابویوسف کی مثال نقل کی ہے کہ علم حدیث میں مہارت اورحذق کے باوجودانہوں نے ان سے کوئی روایت لینی گوارانہیں کی،آخرمیں وہ لکھتے ہیں ”میری جان کی قسم محدثین نے ان دونوں کے حق میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے“۔(۲)

---

(۱)الرفع والتکمیل مع تحقیق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ،ص:۴۱۵

(۲)الجرح والتعدیل للقاسمی

یوں تو عمومی طور پر محدثین نے اہل الرای حضرات سے زیادتی کی ہے جس کا اعتراف اوپر گزر چکا ہے۔ لیکن اس باب میں متاخرین شافعی محدثین میں بطور خاص زیادہ تشدد ہے اور انہوں نے امام ابوحنیفہ کے ترجمہ کو زیادہ سے زیادہ مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ چاہے ساجی ہوں، ابن حبان ہوں یا پھر خطیب، یہ سب ایک ہی دھاگے سے بندھے ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں حنفیہ اور شافعیہ میں بہت زیادہ ٹکراؤ اور تصادم تھا، دونوں کے درمیان لڑائیاں بھی ہوتی تھیں۔ دونوں خلیفہ عباسی کے دربار میں اپنا اقتدار اور اثر ورسوخ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے بسا اوقات ایک دوسرے پر چھینٹا کشی کی جاتی ہے اور یہ چھینٹا کشی بسا اوقات مخاطب فریق سے گزر کر ان کے ائمہ تک پہنچ جایا کرتی تھی، یہ لوگ بھی اسی دور میں پیدا ہوئے، جس معاشرہ میں وہ پلے بڑھے، اس میں احناف سے بےزاری عام تھی، دوسرے اسی دور میں ایک بڑا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے شافعی حضرات کے دل ودماغ پر بہت اثر پڑا اور وہ احناف کی مخالفت میں مزید کوشاں ہو گئے۔

واقعہ یہ ہے:

مشہور شافعی فقیہ اور محدث ابوحامد اسفرائنیؒ کو دربار خلیفہ میں تقرب حاصل ہو گیا اور انہوں نے یہ کیا کہ بغداد کے قاضی ابن الاکفانیؒ جن کی حیثیت چیف جسٹس کی تھی، ان کا جانشیں ابوالعباس البارزی شافعی کو ابن اکفانی سے مشورہ کیے بغیر کر دیا، اور دوسری طرف شیخ ابوحامد اسفرائنیؒ نے سلطان محمد بن سبکتگین اور اہل خراسان کو خط لکھا کہ خلیفہ نے قضا کا کام حنفیہ سے لے کر شافعیہ کو دے دیا ہے۔ یہ بات خراسان میں مشہور ہوگئی اور بغداد والے بھی دو گروہوں میں بٹ گئے، انہی حالات میں ابوالعلاء صاعد بن محمد جو نیشاپور کے قاضی اور خراسان کے احناف کے سربراہ تھے بغداد آئے تو احناف نے ان سے شکایت کی انہوں نے اس بارے میں خلیفہ سے بات کیا، اور بغداد میں دونوں گروپ یعنی حنفیہ اور شافعیہ کے درمیان معاملات بگڑنے لگے تو خلیفہ نے شہر بغداد کے شرفا اور قاضیوں کو جمع کیا اور ایک رسالہ پڑھ کر ان کو سنایا جس کا مضمون یہ تھا: ''اسفرائنی نے امیر المومنین کی خیر خواہی کرنے اور امانت سے کام لینے کے بجائے ان کو گمراہ کیا ہے جب خلیفہ پر اس کی حقیقت واضح ہوگئی کہ اس نے اپنی جانب سے بازری کو اکفانی کا جانشیں بنا دیا اور خلافت عباسی جنہوں نے ہمیشہ احناف کو ترجیح دی تھی اس سے گریز کیا تو اب خلیفہ نے بارزی کو عہدہ سے معزول کر دیا ہے اور حق کو حقدار تک پہنچا دیا ہے اور قاضیوں کے تقرر کے معاملہ میں خلافت عباسی کا جو قدیم طریقہ کار رہا ہے اسے برقرار رکھا جا رہا

ہے۔'' اسی کے ساتھ خلیفہ نے یہ بھی فرمان جاری کیا کہ کوئی ابوحامد اسفرائنی سے ملاقات نہ کرے اور نہ کوئی اس کے سلام کا جواب دے۔ اور خلیفہ نے ابومحمد اکفانی کو خلعت سے نوازا، شیخ ابوحامد الاسفرائنیؒ کیلئے ان حالات میں کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ وہ دارالسلطنت بغداد سے دور کہیں الگ بودوباش کریں۔ (۱)

جس وقت یہ حادثہ رونما ہوا اس وقت خطیب دو سال کے تھے۔ خطیب نے جن شافعی فقہاء سے تعلیم حاصل کی ہے ان میں سے بیشتر انہی شیخ ابوحامد الاسفرائنیؒ کے شاگرد ہیں۔ تو ایسے میں یہ کیسے ممکن ہے کہ خطیب بغدادی اپنی استاذ الاساتذہ کی بے عزتی کے درد کو بھول جائیں جو انہیں احناف کی وجہ سے اٹھانی پڑی، جہاں تک ساجی کا تعلق ہے تو ابن عبدالبر نے اس کے بارے میں تصریح کی ہے'' **والساجي ممن كان ينافس أصحاب أبي حنيفه** ''(۲) ، اور ابن حبان کا جہاں تک تعلق ہے تو اس پر تفصیلی مقالہ کی ضرورت ہے لیکن ایک حد تک ابن حبان کی جانبداری کا پردہ چاک شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے الانتقاء کی تحقیق مین امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں طویل حاشیہ میں کیا ہے۔

خطیب کے تعصب کی بیرونی شہادتیں

● حافظ اسماعیل بن ابوالفضل کی گواہی:

خطیب کے تعصب کے بارے میں ابن جوزی مشہور محدث اسماعیل بن ابی الفضل القومسی سے نقل کرتے ہیں کہ تین محدثین ایسے ہیں جن میں بہت تعصب ہے اور اسی وجہ سے میں ان کو پسند نہیں کرتا۔ (۱) ابوعبداللہ حاکم (۲) ابونعیم الاصفہانی (۳) ابوبکر خطیب بغدادی) حافظ ابن جوزی اس پر مزید اضافہ کرتے ہیں کہ خطیب بغدادی ان دونوں سے تعصب میں بڑھے ہوئے ہیں۔ (۳)

خطیب پر سب سے زیادہ زوردار تنقید حافظ ابن جوزی نے کی ہے، جب کہ خطیب نے ائمہ حنابلہ کے تراجم میں کوئی خاص مذمت کی روایات نقل نہیں کی ہیں۔ خطیب بغدادی کے تعصب پر انہوں نے مختلف کتابوں میں بات کی ہے، حافظ ابن جوزیؒ کی ایک کتاب ہے جس میں شک کے دن میں روزہ رکھنے اور نہ رکھنے

---

(۱) الخطط للمقریزی: ۴/ ۱۴۵

(۲) الانتقاء لابن عبدالبر

(۳) **دراللئوم والضيم فی صوم يوم الغيم لا بن الجوزی بحواله تانيب الخطيب**

کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے،اس مسئلہ میں وہ اس سلسلے میں خطیب کے ذکر کردہ ایک حدیث سے استدلال پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خطیب سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ حدیث جھوٹی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گڑھی ہوئی ہے اور اگر اس جیسی حدیث کی صحت اور ضعف خطیب پر واضح نہیں ہوسکی تو یہ ان کے علم پر ایک داغ ہے،لیکن جب کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ حدیث موضوع ہے،اس کے باوجود انہوں نے اس سے استدلال کیا ہے تو انہوں نے تعصب میں اپنا دین ضائع کردیا، اور علم سے فائدہ نہیں اٹھایا، حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب انتساب کی کوئی بنیاد نہیں ہے، اس حدیث کو ائمہ حدیث میں سے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنن کو جمع کیا،قطعاذکرنہیں کیا ہے، جب کہ انہوں نے ضعیف احادیث کے ذکر میں وسعت سے کام لیا ہے، یہ حدیث تو یعلی بن اشدق کی کتاب میں تھی اور یعلی بن اشدق کی کتاب جھوٹ کا مجموعہ ہے۔(۱)

ایک اور مشہور حنبلی فقیہ اور محدث ابن عبدالہادیؒ ہیں، وہ بھی خطیب کے اس حدیث سے استدلال کرنے پر سخت نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلت: لا تكون عصبيَّةٌ أبلغ من هذا! فليته روى الحديث وسكت، فأمَّا أن يعلم عيبه ولا يذكره، ثمَّ يمدحه ويثني عليه ويقول: فيه كفاية عمَّا سواه. فهذا ممَّا أزرى به على علمه، وأثَّر به في دينه، أتُراه ما علم أنَّ أحدًا يعرف قبح ما أتى؟! كيف وهذا الأمر ظاهرٌ لكلِّ من شَدَا شيئًا من علم الحديث؟! فكيف من أوغل فيه؟! أتُراه ما علم أنَّه في الصَّحيح عن رسول الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أنَّه

(۱)درء اللوم والضيم في صوم يوم الغيم،ص:۳۴

قال:"من روى حديثًا يُرى أنَّه كذبٌ فهو أحد الكاذبِينَ".(۱)

حافظ ابن جوزیؒ قنوت کے مسئلہ میں خطیب پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ فرط عصبیت کی وجہ سے ایسی احادیث سے بھی استدلال کر لیتے ہیں جو انتہائی ضعیف بلکہ موضوع ہوتی ہے اور اس کے ضعف اور وضع کی جانب اشارہ تک نہیں کرتے، جب کہ ان کے علم میں یہ بات ہوتی ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے، اور بقول اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موضوع حدیث کو اس کے وضع کی صراحت کے بغیر ذکر کرنا خود کو جھوٹوں میں شمار کرانا ہے۔

فإيرادُ الخَطيب له محتجّا به مع السكوت عن القدح فيه وقاحة عند علماء النقل وعصبية بارزة وقلة دين لأنّه يعلم أنّه باطلٌ، قال أبو حاتم بن حبان: دينار يروي عن أنس أشياء موضوعة لا يحل ذكرُه في الكتب إلا على سبيل القدح فيه فوا عجبا للخطيب أما سمع في الحديث الصحيح عن رسول الله صلى الله عليه وسلم من حدث عني حديثًا يرى أنّه كذبٌ فهو أحد الكاذبين وهل مثله إلّا كمثل من أنفق بهرجًا ودلّسه فإنّ أكثر النّاس لا يعرفون الكذب من الصّحيح فإذا أورد الحديث محدثٌ حافظٌ وقع في النّفوس أنّه ما احتجّ به إلّا وهو صحيح ولكنّ عصبيّته معروفة ومن نظر من علماء النّقل في كتابه الذي صنّفه في القُنوت وكتابه الذي صنفه في الجَهر ومسألة العتم واحتجاجه بالأحاديث التي يعلم وهاها علم فرْط عَصَبِيّته.(۲)

ابن جوزی نے ابوبکر الخطیب کے خلاف "**السهم المصيب في كبد الخطيب**" کے نام سے ایک پوری کتاب بھی لکھی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) نقيح التحقيق لابن عبد الهادي: ۳/۱۹۸

(۲) التحقيق في مسائل الخلاف: ۱/۴۶۴

خطیب بغدادی نے جہر بالبسلمہ کے باب میں ایک کتاب لکھی ہے اس میں وہ ایسی احادیث لائے ہیں جس کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے۔ جیسے کہ عبداللہ بن زیادہ بن سمعان کی حدیث جس کے ترک پر محدثین کا اجماع ہے۔ امام مالک نے اسے کذاب کہا ہے اور حفص بن سلیمان کی حدیث جس کے بارے میں امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ وہ متروک ہے اور ہر وہ حدیث جس کے بارے میں تعلیقہ میں کلام کر چکا ہوں اور اس کی کمزوری بیان کر چکا ہوں اس کو دوبارہ ذکر نہیں کروں گا۔ خطیب نے ایسی ہی حرکت کتاب القنوت میں بھی کی ہے۔ تو اب جس کا تعصب اس حد تک پہنچ جائے کہ وہ حق کو چھپانے لگے اور مخلوق خدا کو فریب دینے لگے تو ایسے شخص کے بارے میں مناسب ہے کہ جرح وتعدیل کے باب میں بھی اس کی کوئی روایت قبول نہ کی جائے، کیونکہ اس کا قول وفعل اس کی دینداری کی کمی کی نشانی ہے۔

اسی طرح ابن جوزی نے المنتظم میں بھی خطیب بغدادی پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے:

وكان في الخطيب شيئان أحدهما الجري على عادة عوام المحدثين في الجرح والتعديل فإنهم يجرحون بما ليس بجرح، وذلك لقلة فهمهم والثاني التعصب، وقد ذكر في كتاب الجهر بالبسلمة أحاديث يعلم أنها لا تصح، وكهذا فعل أيضا في كتاب القنوت، وذكر في مسالة صوم يوم الغيم حديثاً يدري أنه موضوع، فاحتجّ به، ولم يذكر عليه شيئاً.

● حافظ ذہبی:

حافظ ذہبی نے بھی متعدد کتابوں میں خطیب کے طرز عمل کا شکوہ کیا ہے۔ انہوں نے تذکرۃ الحفاظ میں خطیب کے بارے میں لکھا ہے:

لیت الخطیب لم یحط علی بعض الکبار.(۱)

کاش کے خطیب بعض ائمہ کبار کے سلسلہ میں مثالب کو نہ نقل کرتے۔

اس میں یقینی طور پر امام ابوحنیفہ بھی شامل ہیں؛ کیونکہ امام ابوحنیفہ کا جس طرح کا مسخ شدہ ترجمہ خطیب نے نقل کیا ہے ویسا کسی دوسرے کا نہیں کیا ہے۔اب اگر خطیب کی یہ باتیں نقل کرنے کے لائق تھیں تو حافظ ذہبی کا منع کرنا غلط ہے لیکن نقل کرنے کے قابل بات نہ ہونے کے باوجود خطیب نے نقل کی ہیں تو یہ خطیب کا تعصب اور ائمہ احناف سے نفرت اور بیزاری کا ثبوت ہے اور یہی بات حافظ ذہبی کہنا چاہتے ہیں۔حافظ ذہبی سے قبل یہی بات ابن خلکان نے بھی خطیب کے بارے میں امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں کہی ہے خطیب نے ان کے ترجمہ میں ایسی باتیں نقل کی ہیں کہ جس سے اعراض کرنا چاہئے تھا(۲)؛ کیونکہ ہر نقل شدہ بات اس قابل نہیں ہوتی کہ اس کو کتاب میں درج کیا جائے۔

بسم اللہ زور سے پڑھنے کے موضوع پر خطیب نے جو رسالہ لکھا ہے اس کی تلخیص حافظ ذہبی نے بھی کی ہے اس میں حافظ خطیب بغدادی نے بسم اللہ آہستہ پڑھنے کی حدیث کو خواہ مخواہ کمزور کرنے کی کوشش کی، اس معاملے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث جو ثابت اور بالکل صحیح ہے اس کو خواہ مخواہ کے ایرادات اور تشکیکات سے کمزور کرنے کی ثابت کی اور یہ کہا:

وقد اختلف فی لفظ هذا الحديث اصحاب شعبة عليه اختلافا شديدا وانما اعتبرنا هذه الالفاظ المختلفة فوجدنا ذكر التسمية غير ثابت عن انس.

خطیب کی اس بات پر حافظ ذہبی کہتے ہیں:

هذا هوى وغلو منه.(۳)

یہ خطیب کی نفس پرستی اور غلو ہے۔

اس کے ساتھ ایک اور بھی مسئلہ ہے کہ کسی فقہی جزئی مسئلہ میں کوئی محدث اگر اتنا متشدد ہو کہ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء:۱۸/ ۲۸۹

(۲) وفیات الاعیان

(۳) ستت رسائل للحافظ الذہبی،ص:۱۸۷

جومسلک اس کے امام کا ہواس کیلئے تو کمزاور بلکہ موضوع احادیث پر بھی بلاتر ددنقل کردے اوراس کے وضع وضعف کی کوئی تصریح نہ کرے لیکن اگر مخالف کی روایات صحیح ہیں تو اس کو بھی کمزور کرنے کی کوشش کرے تو کیا ایسا شخص جوکسی کوثقہ اورکسی کوضعیف کہہ رہا ہے اس پر کس قدر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟ بالخصوص مخالف مسلک کے علماء کی تضعیف کے سلسلہ میں۔

آگے چل کر اسی رسالہ میں حافظ ذہبی مزید کہتے ہیں:

ما ادری عذر الخطیب فی رده لمثل هذا، فانا لو تنازلنا وسلمنا له ان حدیث قتادة علی زعمه معلولا، یرد علیه هذا الحدیث فانه لاعلة له.(۱)

میں نہیں جانتا کہ اس طرح کی (صحیح حدیثوں کو) رد کرنے میں خطیب کے بارے میں کیا عذر کیا جائے ،اگرہم بالفرض مان بھی لیں کہ حضرت قتادہ کی حدیث ان کے زعم کے مطابق معلول ہے تو خطیب کے موقف کی تردید میں یہ حدیث ہے اوراس میں کوئی علت بھی نہیں ہے۔

مشہور حنبلی محدث اورفقیہ ابن عبدالہادی حنبلی لکھتے ہیں:

لا تَغتَرّ بكلام الخطيب، فإن عنده العصبية الزائدة على جماعةٍ من العلماء كأبي حنيفة وأحمد وبعضِ أصحابه. وتحاملَ عليهم بكل وجه. وصنَّف فيه بعضُهم "السهم المصيب في كَبِد الخطيب". (۲)

مشہور حنفی محدث اورفقیہ حافظ عینی ابن جوزی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عن ابن الجوزي الحنبلي أنه قال: والخطيبُ لا ينبغي أن يُقبَل جرحُه ولا تعديلُه، لأن قولَه ونقلَه يدل على قِلَّةِ دين. (۳)

---

(۱) ست رسائل للحافظ الذہبی، مختصر الجهر بالبسملة للخطیب، ص:۱۹۰

(۲) البنایہ:۱/ ۶۲۸

(۳) حوالہ سابق

داخلی شہادتیں

کہتے ہیں کہ سب سے بڑی شہادت اور گواہی کسی کے خلاف خود اس کے اعمال ہوتے ہیں۔ خطیب کے تعصب کے شواہد صرف کا ہی نہیں بلکہ داخلی اور اندرونی بھی ہیں۔ یعنی ان کی اپنی تصنیفات اس کی شاہد عدل ہیں کہ امام ابوحنیفہ سے خصوصاً اور احناف سے عموماً بڑی حد تک ان کا دل صاف نہیں ہے۔ دکتور محمد الطحان نے خطیب بغدادی واثرہ فی الحدیث میں اس موضوع پر اچھا کلام کیا ہے۔ ہم مختصراً کچھ ذکر کرتے ہیں۔

خطیب بغدادی نے امام ابوحنیفہ کے فضائل ومناقب کے باب میں اور امام ابوحنیفہ کے مطاعن ومثالب کے باب میں دونوں میں ایسی روایات نقل کی ہیں جس میں سے کچھ صحیح ہیں کچھ حسن ہیں کچھ ضعیف ہیں۔ کچھ موضوع ہیں تو پھر مطاعن ومثالب کی روایات کے بارے میں خطیب علی الاطلاق اور بغیر کسی شرط وقید کے یہ کہتے ہیں:

> ہم نے ماقبل کے باب میں امام ابوحنیفہ کی شان میں ائمہ اہل حدیث سے امام ابوحنیفہ کی تعریف نقل کی ہے؛ لیکن حدیث کے ناقلین کے یہاں جو بات محفوظ ہے وہ یہ کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں ان ائمہ کا کلام تعریف کے برعکس ہے اور ائمہ حدیث نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں بہت زیادہ کلام کیا ہے ان امور کی وجہ سے جو ان سے نقل کیا گیا۔ (۱)

اس کلام میں خطیب بغدادی نے مثالب اور مطاعن کی روایات کو محفوظ کہہ کر یہ کہہ دیا کہ مناقب اور فضائل کی روایات شاذ ہیں اور شاذ روایت مردود ہوتی ہے لہٰذا ان کے فضائل ومناقب میں کچھ بھی ثابت نہیں، حالانکہ مناقب اور فضائل میں بہت سی روایات جو خود خطیب نے نقل کی ہیں ایسی ہیں جو صحیح سند سے ہیں جن کے روات ثقات ہیں، یا پھر جن کی سند حسن لذاتہ اور حسن لغیرہ ہیں اور بہت سی وہ بھی ہیں جن کا ضعف فضائل ومناقب میں گوارا کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس طرح کی روایات پر شاذ ہونے کا حکم خطیب نے کیسے لگا دیا۔ دوسرے مطاعن اور مثالب کی روایات کو انہوں نے محفوظ کہہ دیا، حالانکہ اس میں بہت سی روایات کذاب اور وضاع راویوں سے مروی ہے کچھ روایتیں متہم بالکذب اور متروک روایات سے مروی ہیں۔ کچھ ایسے راویوں سے نقل کی گئی ہیں جن کا ضعف شدید ہے پھر اس طرح کی روایات کو محفوظ کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

---

(۱) تاریخ بغداد: ترجمہ امام ابوحنیفہؒ

اصول کی خلاف ورزی

خطیب نے امام ابوحنیفہ کے ترجمہ میں لکھا ہے:

ہم نے جو اصول مقرر کیا ہے کہ کسی کے بھی ترجمہ میں موافقت اور مخالفت میں جو کچھ مذکور ہو، سب کو نقل کر دیں، اسی وجہ سے ہم امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں وہ سب کچھ نقل کر رہے ہیں، اگر کچھ لوگوں کو برا لگے تو ہم معذرت خواہ ہیں؛ لیکن امام ابوحنیفہ اپنی جلالت قدر کے باوجود دیگر افراد کی طرح ہیں تو جہاں ہم نے ان کے بارے میں سبھی کچھ نقل کیا ہے یہاں بھی ہم ایسا ہی کر رہے ہیں۔ (۱)

لیکن ایسا انہوں نے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے ترجمہ میں نہیں کیا؛ بلکہ ان کے صرف مناقب اور فضائل ہی نقل کئے۔ واضح رہے کہ امام شافعی کو ابن معین نے غیر ثقہ کہا ہے، ان کی فقاہت کو ناپسند کیا ہے اور ان پر کلام کیا ہے، امام عجلیؒ نے ان کو قلیل الحدیث کہا ہے، اسی طرح بعض دیگر ائمہ نے بھی کلام کیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جنہوں نے کلام کیا ہے ان کا کلام صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ مطاعن اور مثالب جو ان دو ائمہ کے حق میں دوسروں نے کہے ہیں اگر غلط بھی ہیں تو اصول کی پاسداری میں نقل کرنا ضروری تھا؛ کیونکہ انہوں نے تاریخ بغداد میں تراجم کے باب میں صحت کا التزام تو کیا نہیں ہے۔ اگر وہ جواب دیں کہ ان کے جلالت قدر کی وجہ سے ایسا کیا گیا تو پھر یہی جلالت قدر امام ابوحنیفہ کے باب میں کیوں نہیں کام آیا۔ دکتور محمود الطحان اس سلسلے میں صحیح لکھتے ہیں:

عندما ترجم للإمامين الشافعي وأحمد بن حنبل رضي الله عنهما لم يذكر في ترجمتهم إلا المناقب فقط، وهو الواجب واللائق بهما وبأمثالهما ولم يذكر ما قاله العلماء فيهما من الطعن ولو كان غير صحيح، فلم يلتزم بقوله "أن أباحنيفة أسوة غيره من العلماء في ذكر أقوال الناس فيهم على تباينها". (۲)

---

(۱) خطیب کے کلام کا مفہوم، تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۶۹، طبع قدیم

(۲) الخطيب البغدادي وأثره في الحديث

● محض امام ابو حنیفہ کے فضائل کے ضعف اور علت کا بیان:

یہ ایک اصولی بات ہے کہ اگر کوئی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب منسوب ہے اور اس روایت میں کوئی کوئی کذاب اور وضاع راوی ہے تو اس کی حقیقت بیان کر دینی چاہئے؛ لیکن خطیب اس بارے میں اتنے دریادل ہیں کہ شرعی مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں رسالے لکھتے ہیں اور اس میں موضوع احادیث بلا دھڑک نقل کرتے ہیں اور اس کے کذب ووضع کی جانب اشارہ تک کرنا گوارا نہیں کرتے؛ بلکہ اس سے دلیل اخذ کرتے ہیں جیسے جہر بالبسلمہ کی روایات، صوم یوم غیم کے مسئلہ اور دیگر موضوعات پر انہوں نے کیا ہے؛ لیکن امام ابوحنیفہ کی منقبت میں انہوں نے ایک حدیث ذکر کی کہ میری امت میں ایک شخص ہوگا جس کا نام نعمان بن ثابت اور کنیت ابوحنیفہ ہوگی وہ میری امت کا چراغ ہوگا۔تو فوراً اس حدیث کے بارے میں خطیب نے لکھا:

قلت: وهو حديث موضوع تفرد بروايته البورقي، وقد شرحنا فيما تقدم أمره، وبينا حاله.[1]

میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث موضوع ہے اس روایت کو صرف بورقی نے نقل کیا اور اس کے احوال کے بارے میں ہم ماقبل میں پوری بات کہہ چکے ہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ خطیب نے اس روایت کو موضوع بتا کر کوئی غلط کام کیا ہے بلکہ انہوں نے بہت صحیح کام کیا ہے اور موضوع حدیث بغیر وضع کی تصریح کے ذکر بھی نہیں کرنا چاہئے سوال یہ ہے کہ دیگر مقامات پر جہاں موضوع احادیث ذکر کرتے ہیں تو وہاں اس کے وضع اور کذب کا بیان کیوں نہیں کرتے؟ اور صرف یہیں پر ان کو بیان اور وضاحت کرنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جب یحییٰ بن معین سے سوال کیا گیا کہ کیا سفیان ثوری نے ابوحنیفہ سے روایت کی ہے تو انہوں نے کہا ہاں، ابوحنیفہ حدیث اور فقہ میں ثقہ اور صدوق تھے اور اللہ کے دین پر مامون تھے، اس پر خطیب نے ٹکرا لگایا:

قلت: أحمد بن الصلت، هو أحمد بن عطية، وكان غير ثقة".

میں کہتا ہوں کہ احمد بن الصلت ہی احمد بن عطیہ بھی ہے اور یہ ثقہ نہیں ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ۱۳/ ۳۳۵-۳۳۶ (طبع قدیم)

صرف یہ دو مثالیں نہیں؛ بلکہ امام ابوحنیفہؒ کے مناقب کے ترجمہ میں اس کی متعدد مثالیں جیسا کہ دکتور محمود الطحان کہتے ہیں۔لیکن اس کے بالکل برعکس مطاعن ومثالب والی روایات میں بھولے سے بھی کیا مجال جوانہوں نے کسی وضاع اور کذاب راوی کے کذب ووضع کی جانب اشارہ کیا ہو،مثال کے طور پر حارث بن عمیر،ضرار بن صرد،علی بن اسحاق بن زاطیا،جریر بن عبدالحمید،قطن بن ابراہیم النشاپوری کے واسطے سے انہوں نے امام ابوحنیفہ کی مذمت میں متعدد روایات نقل کی ہیں؛لیکن کیا مجال جو کہیں بھی کسی راوی کے وضاع ہونے کی صراحت کی ہو۔یہ ہم نے محض بطور نمونہ جیسے دیگ سے چند چاول چنتے ہیں اسی طرح چند راویوں کا انتخاب کیا ہے۔تعجب کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض پر خود خطیب نے تاریخ بغداد میں کلام کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایسے راویوں سے روایتیں نقل کرتے ہین اور پھر اس کو محفوظ سمجھتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ جن پر خطیب ان کے ترجمہ میں کلام کر چکے تھے تو پھر ان پر یہاں پر کلام مکرر کرنا ضروری نہیں سمجھا ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ امام ابوحنیفہ کے مناقب کے باب میں جن راویوں پر خطیب نے کلام کیا ہے ان میں سے بھی بعض پر ان کے ترجمہ میں کلام کر چکے تھے؛لیکن اس کے باوجود مناقب میں دوبارہ کلام کرنا ضروری سمجھا تو یہ روش مطاعن اور مثالب والی روایات میں بھی اختیار کرنا چاہئے تھا۔

● امام ابوحنیفہ کے ترجمہ کے خاتمہ میں برا خواب ذکر کرنا:

خطیب نے امام ابوحنیفہ کے ترجمہ کے اخیر میں برے خواب ذکر کئے ہیں جس میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے جنازے کے اوپر کالا کپڑا تھا اور ارد گرد عیسائی پادری اور راہب موجود تھے۔سوال یہ ہے کہ حدیث میں برے خواب کے ذکر کرنے سے منع کیا گیا ہے تو اگر کسی نے خواب دیکھا اور اس کو امام ابو یوسف سے ذکر کر دیا تو امام ابو یوسف نے اس کو حدیث کی تعمیل کرنے کا حکم دیا کہ کسی سے بیان مت کرنا؛لیکن خطیب نے حدیث کے صریح مفہوم کو نظر انداز کرتے ہوئے اس برے خواب کا ذکر کر دیا۔کیا خطیب نے 60 سے زائد صفحات مین جو کچھ امام ابوحنیفہ کے مطاعن اور مثالب میں نقل کیا تھا اس سے ان کو تسلی نہیں ہوئی کہ مزید براں خواب ذکر کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔دکتور محمود الطحان نے طنزیہ انداز میں درست طور پر لکھا ہے:

فإذا كان الرائي خالف الحديث وقص على الناس -على فرض صحتها- فما بال الخطيب يعينه على نشرها وإفشائها، بتسطيرتها مسندة في تاريخه الذي سيقرأه

الناس على مر الأجيال، لعل الخطيب أعتبرها رؤياً حسنة في جانب أبي حنيفة، الذي ما ولد في الإسلام أشأم منه، فأراد تثبيتها ونشرها، ابتغاء وجه الله واتباعاً للسنة.(۱)

خطیب کا یہی حال کچھ امام ابو یوسف اور امام محمد کے تذکرہ میں بھی ہے جب کہ اس کے بالمقابل خطیب نے امام شافعی کے اصحاب کا ذکر اس انداز سے نہیں کیا ہے کہ جہاں سے جو کچھ بھی ملا اسے نقل کر دیں، یہ بھی خطیب کا طرفہ تماشا اور ان کی دورنگی کی مثال ہے۔

خطیب بغدادی نے امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں جو کچھ نقل کیا ہے اسے پڑھ کر خالی الذہن انسان یہی سوچے گا کہ دنیا میں جتنی برائیاں تھیں سب ان میں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ سب خطیب نے بلا تامل نقل کر دیا اور اس کو تاریخی امانت باور کیا لیکن اس سے بہت کم تر درجے میں جب کچھ احناف نے امام شافعی کے بارے میں کہا کہ علم حدیث میں ان کا مرتبہ کم ہے اسی وجہ سے صحیحین میں ان کی روایات موجود نہیں ہیں۔ اس پر خطیب کو طیش آ گیا اور پوری کتاب لکھ دی اور یہ کہنے والوں کو جو کچھ مارے غصہ کے کہا ہے وہ ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ ان کا امام شافعی کیلئے جوش وجذبہ دیکھنے کے قابل ہے؛ حالانکہ کہنے والوں نے صرف امام شافعی کی قلت حدیث اور صحیح بخاری میں ان کی حدیث نہ ہونے کا اعتراض کیا تھا لیکن خطیب کا اپنا طرز عمل امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں یہ ہے کہ انہوں نے امام ابو حنیفہ کے ترجمہ میں دنیا بھر کی برائیاں نقل کر دیں اور صرف ایک بیان دے کر بری گئے کہ اسوۃ غیرہ من العلماء۔ حقیقت یہ ہے کہ خطیب نے اس کتاب میں جو کچھ اپنے مخالفین کو کہا ہے اس کے اولین مستحق وہ خود ہیں۔

مقدمہ میں خطیب امام شافعی کی احادیث پر اعتراض کرنے والوں کو جاہلین کے لقب سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وذكر أن بعض من يذهب إلى رأي أبي حنيفة ومقالته ضعف أحاديث للشافعي واعترض بالطعن عليه في روايته لإعراض أبي عبد الله البخاري عنها واطراحه ما انتهى إليه منها، ولولا ما أخذ الله تعالى على العلماء فيما

---

(۱) الحافظ الخطیب البغدادی وأثره فی علوم الحدیث، ص:۳۴۵

يعلمونه ليبيننه للناس ولا يكتمونه لكان أولى الأشياء الإعراض عن اعتراض الجهال والسكوت عن جوابهم فيما اجترأوا عليه من النطق بالمحال وتركهم على جهلهم يعمهون بتحيرهم في الباطل والضلال.(۱)

اس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ خطیب نے امام شافعی کی احادیث کو ضعیف قرار دینے والوں کو جاہل ،اور باطل وضلال کا حامل قرار دیا ہے۔آگے چل کر خطیب بیان کرتے ہیں کہ بعض اہل علم نے یہ بات مجھ سے بھی کہی اورامام مسلم کی صحیح اورابوداؤد کی سنن کے امام شافعی کی حدیثوں سے خالی ہونے کو دلیل بنایا۔اس پر خطیب بغدادی تو اولاً روایت نقل کرتے ہیں کہ دجال اعظم کے نکلنے سے پہلے تیس چھوٹے چھوٹے دجال نکلیں گے۔ خطیب بین السطور میں کہنا چاہتے ہیں کہ امام شافعی پر یہ اعتراض کرنے والے انہی دجالین میں سے ایک ہیں۔پھر عربی شاعر کا شعر نقل کیا ہے،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی جواں مرد کا لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے تو حسد کے مارے اس کی برائیاں کرنے لگتے ہیں،اسی طرح جب کسی خوبصورت عورت ست سوکنیں جلنے لگتی ہیں تو اس کو حسد کی وجہ سے بدصورت کہنے لگتی ہیں،اسی طرح سے خطیب بغدادی نے بالواسطہ طور پر یہی کہنا چاہا ہے کہ امام شافعی پر کلام کرنے والا حاسد ہے۔

آگے وہ لکھتے ہیں:

ففي بعض ما ذكرنا من معالم الشافعي ما يوجب الحسد والكذب عليه، وما الذي يضره ويقدح فيه، من جهل عدوه ومناوئيه.(۲)

آگے چل کر خطیب لکھتے ہیں:

وأنا ذاكر من شواهد أخباره، ومورد من مشهور أذكاره، نبذة موجزة يسيرة تزيد المستبصر بصيرة وتكبت العدو الحاسد، وتخصم الألد المعاند.(۳)

---

(۱)مسألة الاحتجاج بالشافعي فيما أسند إليه والرد على الطاعنين بعظم جهلهم عليه،ص:۲۳

(۲)حوالۂ سابق،ص:۴۲ (۳)حوالۂ سابق،ص:۷۹

یہاں پر خطیب نے امام شافعی پر اعتراض کرنے والوں کو ’’عدو، حاسد، الد، المعاند‘‘ کہا ہے، کتاب کے آخر میں خطیب ایک اور سوال کا جواب دیتے ہیں سوال یہ ہے کہ دیگر فقہاء بھی ایسے ہیں کہ جن کے فقہی شہرت کے باوجود ان کی روایت حدیث کو محدثین نے رد کر دیا ہے تو ایسا ہی امام شافعی کے سلسلے میں کیوں نہیں سوچا جا سکتا۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ دونوں میں فرق ہے۔ وہ فقہاء حضرات جن کی احادیث کو محدثین نے رد کر دیا ہے جیسے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، ابن ابی لیلیٰ وغیرہ تو ان کے اور امام شافعی کے درمیان فرق ہے۔

یہاں سے خطیب نے امام ابوحنیفہ امام ابویوسف اور امام محمد بن الحسن پر محدثین کے کلام نقل کرنے شروع کئے ہیں اور کمال یہ کیا ہے کہ صرف جرح کے اقوال نقل کیے ہیں، اور ان کی تعریف میں محدثین اور فقہاء نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس سے بالکل ہی صرف نظر کر لیا ہے، علم وتحقیق کی دنیا میں اس طرح کا تعصب اور یکطرفہ رویہ قطعاً قابل قبول نہیں، وہ بھی خطیب جیسے اعلیٰ درجہ کے محدث اور فقیہ سے، مثلاً امام ابویوسف کے ذکر میں یزید بن ہارون کا یہ قول نقل کیا ہے:

وہ یتیموں کے مال کو تجارت میں لگا دیتے تھے اور اس کا فائدہ خود رکھ لیتے تھے۔

یہ ایک فقہی مسئلہ ہے بعض حضرات اسے جائز کہتے ہیں بعض اسے ناجائز کہتے ہیں امام ابویوسف خود مجتہد تھے انہوں نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا، اس کا حدیث کے ضعف سے کیا لینا دینا ہے؟ دوسرے اگر بنظر احتیاط دیکھیں تو اس میں یتیموں کا ہی فائدہ ہے۔ اگر وہ یتیموں کے اموال کو اپنے پاس بطور امانت رکھتے اور اس میں کچھ ضائع ہو جاتا مثلا چوری ہو گیا، یا مال تلف ہو گیا تو ان پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی لیکن اب جب اس کو تجارت میں لگا دیا تو اب وہ خود ضامن بن گئے اور اگر تجارت میں مال تلف ہو گیا تو اب امام ابویوسف کی ذمہ داری تھی کہ وہ ان اموال کی پابجائی کریں اور چونکہ نقصان کے وہ تنہا ذمہ دار تھے اس لئے نفع کے بھی وہی حقدار تھے۔

دوسرا امام عبداللہ بن المبارک سے نقل کیا ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ امام ابویوسف اور محمد بن الحسن میں زیادہ سچا کون ہے تو انہوں نے کہا کہ یہ مت کہو بلکہ یہ کہو کہ زیادہ جھوٹا کون ہے؟ اس بات کا اگرچہ نفس حدیث سے تعلق ہے لیکن خطیب یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ عبداللہ بن المبارک کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ بہت سخت تھا جو کہ امراء اور حکام سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ میں بادشاہوں کے کپڑے سیتا ہوں تو کیا میں بھی ظلم وجور میں ان کے معاونین میں شمار ہوؤں گا فرمایا کہ معاون میں تو وہ لوگ شمار ہوں گے جو کپڑا بنتے ہیں یعنی کپڑا تیار کرتے ہیں تمہارا شمار تو ظالمین میں ہی ہوگا۔ عبداللہ بن المبارک کے

ترجمہ میں اس طرح کی متعدد مثالیں دیکھیں جاسکتی ہیں۔ پھر سوچئے کہ امام ابو یوسف قاضی القضاۃ تھے۔ امام محمد بن الحسن بھی قاضی تھے۔ خلافت عباسی سے دونوں کا ہی گہرا تعلق تھا۔ ایسے میں عبداللہ بن المبارک جو کچھ نہ کہیں وہ کم ہے۔ اگر عبداللہ بن مبارک سے امام شافعی کے بارے میں پوچھا جاتا جب وہ یمن میں خلافت عباسیہ کی جانب سے برسر کار تھے تو ان کا موقف ان کے بارے میں بھی کچھ کم شدید نہ ہوتا، کیونکہ حکام امرا اور سلاطین سے ربط وتعلق رکھنے والوں سے وہ بہت برگشتہ خاطر رہتے تھے؛ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر تمام اچھے لوگ حکومت سے اعراض کریں اور حکومت کے دروبست پر حاوی نہ ہوں تو اس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ حکومت برے لوگوں کے حوالہ کردی جائے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امام حدیث وجرح وتعدیل یحیی بن معین نے امام ابو یوسف کو ثقہ کہا ہے۔ امام نسائی نے ثقہ کہا ہے۔ ابن حبان نے ثقہ کہا ہے۔ ابن عدی نے ثقہ کہا ہے۔ دیگر محدثین نے بھی اسی طرح کی باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک بھی بات خطیب نے ذکر نہیں کی۔ حالانکہ خطیب کو امام ابو یوسف کے بارے میں محدثین کی توثیق اچھی طرح معلوم ہے۔ اسی طرح خطیب کو یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ امام محمد بن الحسن کی روایت سے امام شافعی نے کتاب الام وغیرہ میں استدلال کیا ہے؛ لیکن خطیب نے ان میں سے کسی بھی بات کو ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

خاتمہ

بحث کے خاتمہ تک قارئین پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ خطیب اگرچہ علم حدیث میں ماہر ہیں اور صرف ماہر نہیں بہت ماہر ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں احناف سے بالخصوص ائمہ احناف سے تعصب ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ محدثین نے ان کی بہت تعریف کی ہے پھر تعصب کا الزام کیسے ثابت ہوسکتا ہے تو ہم کہیں گے کہ کسی فن میں مہارت اور چیز ہے اور کسی گروہ سے نفرت اور تعصب الگ شے ہے۔ محدثین نے علم حدیث میں ان کی مہارت کی تعریف کی ہے ان سے تعصب کی نفی نہیں کی ہے۔ معلمی نے تنکیل میں ضرور خطیب سے تعصب کا داغ دھونے کی کوشش کی ہے لیکن اس میں وہ قطعا کامیاب نہیں رہے۔ انہوں نے اس میں ابن جوزی کے سب سے کمزور قول کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ خطیب نے امام شافعی کو تاج الفقہاء لکھا اور امام احمد کو سید

المحدثین ،خطیب نے ان کی فقاہت کا ذکر کیوں نہیں کیا۔لیکن ابن جوزی نے جہاں موضوع روایت کو بطوراستدلال ذکرکرنے کوتنقید کا نشانہ بنایاہے،اس اعتراض سے معلمیؒ خاموشی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔کمال کی بات یہ ہے کہ حافظ سیوطی جیسے مرنجاں مرنج اورصلح کل کا عقیدہ رکھنے والے بزرگ نے بھی خطیب کے خلاف ایک کتاب لکھی ہے جس کانام ہے:

السهم المصيب في نحر الخطيب.

کتاب کے موضوع سے عنوان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ان کے علاوہ دیگرشافعی علماء نے بھی خطیب کے طرزعمل کو تنقید کا نشانہ بنایاہے۔ اب دورحاضر میں کچھ غیرمقلدین نے خطیب کی جانب سے دفاع کا بیڑااٹھایاہے اوراس کا منشاء پوشیدہ نہیں ہے لیکن ہم اس پر یہی کہہ سکتے ہیں جب شافعی حضرات کوخطیب کےتعصب کااقرارہےاورداخلی وخارجی شہادتیں خطیب کےتعصب کی گواہ ہیں تو پھر حقائق پر پردہ ڈالنے سے حقائق چھپ نہیں جائیں گے۔

ایک سوال کا جواب

ایک سوال جو حدیث کے طالب علم کےذہن میں پیدا ہوسکتا ہے وہ یہ کہ کہ خطیب کو تمام ترجمہ نگاروں نے ثقہ ثبت لکھاہے،ایسے میں پھران پرتعصب کا الزام کیوں کرعائد ہوسکتا ہے کیونکہ تعصب تو ثقاہت کے منافی عمل ہے، اس کے دوجواب ہیں۔ پہلاتو یہ ہے کہ گناہوں سے سوائے انبیاء کے کوئی محفوظ نہیں ہے۔خامیاں اورکوتاہیاں کم وبیش سبھی میں موجودہیں چاہے وہ ناقدین حدیث ہوں یا پھرفقہاءکرام۔لیکن کسی کی اچھائی یابرائی کا فیصلہ اس پرکیا جاتاہے کہ اس کے اندرزیادہ مقدار میں کیاچیز موجود ہے۔توجس پرتعصب کاالزام ہے ان کی ذات میں دوسرے بہت سے اچھے پہلوموجود ہیں تواس ایک خراب کا پہلو کا ہونا ان کی عدالت کے منافی نہیں ہے۔عدالت کے منافی جب ہوتا جب ان کی اچھائیوں یاخوبیوں سے زیادہ ان کی برائیاں ہوتیں۔جیسا کہ حضرت عبداللہ بن المبارک نے کہاکہ:

ثقہ وہ ہے کہ جس کی غلطیاں کم ہوں اورصحیح روایتیں زیادہ ہوں۔

جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ مشہورشیعی محدث ابن خراش عموما اہل سنت راویوں کی تضعیف کرتے ہیں جب کہ اس کے بالمقابل مشہورناقد حدیث جوزقانی ہیں جن پر ناصبیت کا مشہورالزام ہے وہ ان رواۃ پر جو اہل

سنت میں سے ہیں لیکن جن کے اندر تھوڑی شیعیت ہے سخت کلام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجر ہدی الساری مقدمہ فتح الباری لکھتے ہیں کہ اختلاف عقائد کے سبب جرح مقبول نہیں ہوگی اور مثال میں انہی دونوں کو پیش کیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ انسان کا کسی چیز پر اعتقاد اتنا پختہ ہوجاتا ہے کہ وہ اس کے خلاف تمام باتوں کو غلط، باطل اور خلاف حق سمجھتا ہے یا کسی گروہ یا فرد کے بارے میں وہ جانبداری سے کام لیتا ہے لیکن وہ اس کو انجانے میں اپنی دینی حمیت کا تقاضہ سمجھتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ تعصب سے کام لے رہا ہوتا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتو پھر ہم کیسے تاویل کریں گے کہ جب احمد بن صالح المصری نے امام انسائی کو اپنی مجلس سے اٹھادیا تو انہوں نے ان پر جرح کردی، امام مالک کے نسب میں جب محمد بن اسحاق نے کلام کیا تو امام مالک نے دجال من دجاجلہ جیسی بات کہہ دی، پھر اس کے علاوہ اسی تعصب، حسد اور دیگر اسباب سے معاصرین نے ایک دوسرے پر کلام کیا ہے اور بقول حافظ ذہبی اس سے کوئی دور خالی نہیں رہا ہے۔ بقول حافظ ذہبی اگر اس پر لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

حافظ ابن صلاحؒ اسی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس مسئلہ میں متعدد لوگوں نے غلطی کرتے ہوئے ایسی جرح دوسروں پر کی ہے جو صحیح نہیں ہے اور اسی میں سے نسائی کی جرح احمد بن صالح پر ہے، حالانکہ وہ امام، حافظ اور ثقہ ہیں ان پر کوئی حقیقی جرح نہیں ہے۔ ان سے بخاری نے اپنی صحیح میں روایت نقل کی ہے، نسائی کی جرح کی حقیقت یہ ہے کہ احمد بن صالح نے نسائی سے درشت رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے نسائی کا دل ان سے مکدر ہوگیا۔ اور جب امام نسائی جو جرح وتعدیل کے امام ہیں ایسی بے بنیاد جرح کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نفرت جب دل میں راسخ ہوجاتی ہے تو دل اس نفرت کے کچھ جواز تراش کرلیتا ہے۔ یہ جواز حقیقی نہیں ہوتے ہیں لیکن انتہائی نفرت کی وجہ سے اس کی حقیقت کی جانب نگاہ نہیں جاتی۔ نہ کہ بے بنیاد جرح ان سے جان بوجھ کر ہوتی ہے۔ اس کو جان لو، یہ انتہائی نفیس

اور اہم نکتہ ہے۔ (۱)

مشہور شافعی فقیہ اور محدث اور تذکرہ نگار امام سبکیؒ اسی موقف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کبھی جرح کرنے والا خواہش نفس سے بری نہیں ہوتا لیکن اس کو اپنی اس علت کی خبر نہیں ہوتی بلکہ اپنی جہالت اور بدعت کی وجہ سے اس کو حق سمجھتا ہے تو وہ زیادہ غور وفکر سے کام نہیں لیتا ہے جس سے اس کو پتہ چلے کہ وہ جسے حق سمجھ رہا ہے، وہ نفس پرستی ہے، اور یہ زیادہ تر ان کے ساتھ کیا جاتا ہے جو عقیدہ میں مخالف ہوتے ہیں، اس بناء پر مناسب یہ ہے کہ مخالف عقیدہ والے کا قول دوسرے مخالف عقیدہ والے کے بارے میں علی الاطلاق قبول نہ کیا جائے، ہاں مگر یہ کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا اس کی حقیقت کو مدلل طور پر سمجھا ہو۔ (۲)

(۱) علوم الحدیث لابن الصلاح: ۳۹۰

(۲) **قاعدة فی المؤرخین للسبکی**، ص: ۷۳

فتاوی ہندیہ کے بعض اہم قلمی مصادر

(۲)

مولانا محمد ندوی ❖

پہلی قسط اورنگ زیب عالم گیر رحمہ اللہ کی مختصر سوانح اور ان کی نمایاں خدمات میں سے ایک فتاوی عالم گیری کی تدوین وتالیف اوراس کے محرکات واسباب کا ذکر تھا،اور فتاوی عالم گیری میں فقہ حنفی کی جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے،ان میں سے بعض ان کتابوں کا تذکرہ تھا جواب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے، یاحال فی الحال میں شائع ہوئی ہے،اسی سلسلہ کی یہ دوسری کڑی ہے، جو حاضر خدمت ہے۔

رمز الحقائق

علامہ نسفیؒ کی تصنیف کنز الدقائق کو فقہ حنفی میں متون کا درجہ حاصل ہے،اور ہر زمانہ میں اسے اہل علم کی توجہ حاصل رہی ہے، یہی وجہ کہ علماء احناف نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں، جن میں مختصر،متوسط اور مطول شرحیں شامل ہیں،ان میں البحر الرائق،تبیین الحقائق،النہر الفائق،منحۃ الخالق وغیرہ بہت مشہور، قابل اعتماد اور مقبول شرحیں ہیں،انہیں شروحات میں ایک متوسط،مفید اور اہم شرح رمز الحقائق ہے، جو عینی شرح الکنز کے نام سے معروف ہے، یہ شرح علامہ بدرالدین عینی محمود بن احمد حنفی المتوفی 855ھ کی تصنیف ہے،اس شرح کی تکمیل 818ھ میں ہوئی۔ (۱)

علامہ عینی بیک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی،فقیہ بھی تھے اور اصولی بھی،نحوی بھی تھے اور صرفی بھی، تاریخ ولغت کے حافظ بھی تھے اور نثر ونظم کے شہسوار بھی، نیز عربی اور ترکی زبان کے یکساں ماہر تھے،مدتوں آپ نے کار قضاء وافتاء اور درس وتدریس کے فرائض انجام دئے اور ساتھ ہی تمام علوم وفنون میں

❖ باحث شعبۂ تحقیق: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

(۱) معجم المطبوعات العربیۃ والمعربۃ: 1404/2

کتابیں بھی تصنیف کی، آپ کی تصنیفات کو دیکھنے سے آپ کی فہم وبصیرت، راسخ العلم اور مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، آپ نے مسلک حنفی میں گراں قدر خدمات انجام دی اور حدیث کی سب سے مستند کتاب ''صحیح البخاری'' کی شہرۂ آفاق شرح ''عمدۃ القاری'' تصنیف کی، نیز فقہ حنفی کی معتبر متون ہدایہ اور کنز کی بالترتیب ''البنایہ فی شرح الہدایہ'' اور ''رمز الحقائق فی شرح کنز الدقائق'' مفید اور عمدہ شرح لکھی، اور ان میں مسائل کی تائید میں عقلی ونقلی دلائل ذکر فرمائے۔ (۱)

رمز الحقائق کی وجہ تصنیف کو علامہ عینیؒ نے اس کے مقدمہ میں صراحت کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کو اپنے بعض ہم عصر علماء کی حسد کی وجہ سے بہت سی مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، بقول آپ کے: دنیا اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر اس طرح تنگ اور تاریک ہوگئی کہ گویا میں ایسا ہوگیا کہ میرے پاس آنکھیں تو تھیں، لیکن میں انسان نہیں تھا، یا میں انسان تو تھا؛ لیکن میرے پاس آنکھیں نہیں تھی؛ میں سوچتا تھا کہ اگر یہ سب اللہ تعالی کی طرف سے ہے تو میں راضی برضا ہوں؛ کیونکہ لوگ تو ہمیشہ قیل وقال میں مصروف رہتے ہیں، پھر اللہ تعالی نے اس غم کو امت کے بعض مخلصین کے ہاتھوں دور فرما کر مجھ پر احسان کیا، لہذا میں اپنے دل کو کسی کتاب کی شرح لکھنے میں مشغول رکھ کر ان کدورتوں کے ازالہ کا ارادہ کیا اور علامہ نسفی کی کتاب کنز الدقائق کا انتخاب کیا، جس کی بہت سی شروحات لکھی گئی ہیں؛ لیکن ان میں سے بعض ایسے ہیں جن سے اکتاہٹ ہوتی ہے اور بعض وہ ہیں جن میں حد درجہ خلل ہے؛ لہٰذا میں نے اللہ تعالی سے استخارہ کیا اور اس کی شرح اس طرح لکھی کہ اس کی پیچیدگیوں کو واضح کیا اور اس کے مغز کو نکالا، اور در پردہ باتوں کو ظاہر کیا، مشکل مسائل کو اعتدال کے ساتھ واضح کیا، افراط وتفریط سے بچتے ہوئے حل متن وترکیب پر اکتفاء کرتے ہوئے ترتیب وار دلائل کا ذکر ذکر کیا، اور اس کا نام رمز الحقائق فی شرح کنز الدقائق رکھا۔ (۲)

یہ کتاب پہلی بار مصر سے تقریباً ڈیرھ سو سال قبل اور ہندوستان سے سو سال قبل شائع ہوئی تھی؛ لیکن اب بھی اس پہ علمی تحقیق وتعلیق کی ضرورت ہے، فتاوی ہندیہ میں اس کتاب سے متعدد مسائل منقول ہیں، البتہ اصل نام کے بجائے ''كذا يا هكذا في العيني شرح الكنز'' سے اس کو بیان کیا گیا ہے، اس کتاب کا

---

(۱) **الضوء اللامع لأهل القرن التاسع**: 10/ 134، نیز دیکھئے: **النجوم الزاهرة فى ملوك مصر والقاهرة**: 16/ 10، **البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع**: 2/ 294۔

(۲) رمز الحقائق، ص: 1-2، مخطوطہ۔

قلمی نسخہ مختلف مکتبات میں ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

1- مکتبہ کوبریلی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 582۔

2- مکتبہ ولی الدین جار اللہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 695۔

3- مکتبہ دار العلوم دیو بند - انڈیا، مخطوطہ نمبر: 67/303۔

4- خدابخش لائبریری، پٹنہ - انڈیا، مخطوطہ نمبر: (1697)-(352و)

5- مکتبہ فیض اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 772۔[۱]

تہذیب الواقعات

اس کتاب کا مکمل نام ''تہذیب الواقعات فی فروع الحنفیہ'' ہے، یہ کتاب شیخ امام احمد ابوعبداللہ قلانسی کی ہے، جوایک جلد میں ہے، یہ کتاب بھی فقہ حنفی کی عام فقہی ترتیب پر ہے، ابتداء کتاب الطہارہ سے ہے اور کتاب الفرائض پر مکمل ہے، ہر کتاب چند ابواب اور فصول پر محیط ہے، اس کتاب سے صاحب خلاصۃ الفتاوی، علامہ ابن نجیم مصریؒ، علامہ ابن عابدین شامیؒ، علامہ شہاب الدین شلبیؒ، علامہ طرابلسیؒ وغیرہ نے اپنی تصانیف میں استفادہ کیا ہے، اور فتاوی عالمگیری میں بھی اس کتاب کے متعدد مسائل منقول ہیں، متأخرین علماء احناف کی کتابوں میں جہاں کہیں بھی تہذیب کا حوالہ ہے تو اس سے یہی کتاب مراد ہے، مصنف نے اس کتاب میں ہر موضوع سے متعلق اہم مسائل کو اختصار کے ساتھ آسان اور عام فہم زبان میں ذکر کیا ہے، نیز دلائل اور دوسرے مصنفین کی کتابوں کے نام کو ذکر کرنے سے اجتناب کیا ہے، ائمہ کے اختلاف کو مختصراً ذکر کیا ہے، مصنف کس صدی کے ہیں، اس میں قدرے اختلاف ہے، بعض اہل علم نے دسویں، بعض نے گیارھویں صدی کا ذکر کیا ہے، فواد سزکین نے چوتھی صدی ہجری کا ذکر کیا ہے[۲]، اور بظاہر یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ خلاصۃ الفتاوی اور دوسری کتابوں سے اس کی تائید ہوتی ہے، یہ کتاب اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، جس کا قلمی نسخہ دنیا کے متعدد مکتبات میں موجود ہیں، جن میں سب سے قدیم نسخہ مکتبہ شستر بیتی ڈبلن کا ہے جو ۹۳۹ھ ہجری میں لکھی گئی ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے ان مکتبات میں ہیں:

(۱) الفہرس الشامل: 109/4، خزانۃ التراث - فہرس مخطوطات: 48/ 626

(۲) تاریخ التراث العربی لفواد سزکین - العلوم الشرعیۃ: 3/ 90، نیز دیکھئے: معجم المؤلفین: 2/ 51، الجواہر المضیہ: 1/ 134

1- مکتبہ شستر بیتی ڈبلن، مخطوطہ نمبر:4417۔
2- متحف طوب قاپی سرای، استنبول، ترکی، مخطوطہ نمبر:(4215)A.873۔
3- مکتبہ نیشنل لائبریری، پیرس، مخطوطہ نمبر:973۔
4- مکتبہ ایا صوفیا، ترکی، مخطوطہ نمبر:1078۔
5- مکتبہ ینی جامع، ترکی، مخطوطہ نمبر:381۔ (۱)

کمال الدرایہ فی شرح النقایہ (الشمنی)

صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعودؒ کی کتاب مختصر الوقایہ (جو النقایہ سے مشہور ہے) کی متعدد اہل علم نے شرح لکھی ہے، جن میں علامہ قہستانیؒ، عبد العلی برجندیؒ، ملا علی قاریؒ، قاسم ابن قطلو بغاؒ، محمود بن الیاس رومیؒ، ابوالمکارم بن عبد اللہؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں، انہیں شارحین میں ایک مشہور مصنف ابو العباس احمد بن محمد شمنیؒ متوفی 872ھ ہیں، آپ کی اس شرح کا مکمل نام کمال الدرایہ فی شرح النقایہ ہے، لیکن عوام وخواص میں شرح مختصر الوقایہ یا شرح شمنی کے نام سے مشہور ہے، یہ اوسط درجہ کی عمدہ شرح ہے اور علماء میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، چونکہ علامہ شمنیؒ علمی دنیا میں نمایاں اور امتیازی مقام رکھتے تھے، آپ کو کئی علوم میں ید طولی حاصل تھا، آپ مفسر بھی تھے اور محدث بھی، ادیب بھی تھے اور فقیہ بھی، اصولی بھی تھے اور کلامی بھی، علم نحو کے امام بھی تھے اور علم بیان کے ماہر بھی، مختلف فنون میں آپ نے کتابیں تصنیف کی، علامہ سیوطیؒ اور علامہ سخاویؒ جیسے اہل علم کے استاذ رہے، شروع میں آپ مالکی مذہب کے پیرو تھے، پھر آپ نے حنفی مسلک کو اختیار کر لیا۔ (۲)

اس شرح کی تصنیف کے سلسلہ میں خود آپ لکھتے ہیں کہ میرے بعض ان بھائیوں نے (جن کی حیثیت میرے نزدیک ایسی ہی تھی جیسے انسان کے لئے اس کی آنکھ) مجھ سے خواہش کی کہ میں صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود بن تاج الشریعہ کی مختصر الوقایہ (جو النقایہ سے معروف ہے) کی شرح لکھوں تو میں نے معذرت کر لی، لیکن انہوں نے میری معذرت قبول نہیں کی اور برابر اصرار کرتے رہے، لہذا میں نے ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اس کو لکھنے کا عزم کر لیا۔ (۳)

---

(۱) الفہرس الشامل:2/734، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث- فہرس مخطوطات:50/820۔
(۲) الطبقات السنیۃ فی تراجم الحنفیۃ ،ص:145، الفوائد البہیۃ فی تراجم الحنفیۃ ،ص:112، کشف الظنون:2/1972۔
(۳) شرح النقایہ للشمنی ،ص:1، مکتبہ شہید علی باشا، ترکی، مخطوطہ نمبر:859۔

یہ شرح مخطوطہ کی شکل میں ہے، جس پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے، اس کتاب کا مخطوطہ دنیا کے مختلف مکتبات میں ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

1- مکتبہ شہید علی باشا، ترکی، مخطوطہ نمبر:859۔

2- مکتبہ ولی الدین جاراللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر:720 اور 759۔

3- مکتبہ دارالعلوم دیوبند، انڈیا، مخطوطہ نمبر:57/293۔

4- مکتبہ اوقاف عامہ، بغداد، مخطوطہ نمبر:10603۔

5- مکتبہ دارا کتب، قاہرہ، مخطوطہ نمبر:401-403۔[1]

مختار الفتاوی

محمد بن احمد بن محمد طاہری سا کئیؒ کی تصنیف ہے، اس کے مصنف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ دوستوں کا تقاضا ہوا کہ میں علماء ومشائخ احناف کی کتابوں سے ایسے مسائل کو یکجا کردوں جو مفتی بہا ہیں، اور جن کو فتوی دینے میں پسند کرتے ہیں، چنانچہ میں نے ان کی یہ فرمائش پوری کی، سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کی، اور مسائل کا انتخاب کیا، پچاس کتابوں کا نام بھی مصنف نے لکھا ہے، ان کتابوں سے ایسے مسائل کتاب اور فصل وار جمع کردئے ہیں جن پر فتوی دیا جاتا ہے، نیز مصنف نے نوادر سے مسائل نہیں لئے اور نہ کسی مسئلہ کی دلیل دی؛ تاکہ مطالعہ کرنے والے بآسانی مطالعہ کرسکیں، تنقیح وتصحیح میں کوئی کوتاہی نہیں ہونے دی، اس کتاب کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے فتاوی سے متعلق واقعتاً مسائل کا ایک بڑا ذخیرہ اس میں قدوری کی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے جو ایک نہایت قیمتی ذخیرہ ہے[2] لیکن اب تک یہ اہل علم کی نظر عنایت سے دور ہے، اور مخطوطہ کی شکل میں ہے، اس پر علمی وتحقیقی کام کرکے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے، اس کتاب کا مخطوطہ دنیا کے مکتبات میں زیادہ نہیں ہیں، البتہ جو بھی ہے وہ درج ذیل ہیں:

1- رضالائبریری رامپور، انڈیا، مخطوطہ نمبر:[M5212(2341)]۔

---

(۱) الفہرس الشامل:8 / 239-236، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث- فہرس مخطوطات: 50 / 873، معجم تاریخ التراث الاسلامی لفوادسزکین:1 / 485۔

(۲) دیکھئے: مختار الفتاوی، مقدمہ، ص:1، مخطوطہ نیشنل لائبریری، طہران، ایران۔

2- معہد الابحاث العربیہ والفارسیہ، ٹونک، انڈیا، مخطوطہ نمبر: [T-785(999)]۔

3- مکتبہ دار العلوم دیوبند، انڈیا، مخطوطہ نمبر: 99/336۔

4- نیشنل لائبریری، طہران، ایران، مخطوطہ نمبر: 1061۔

5- معہد الاستشراق، بطرسبورغ، روس، مخطوطہ نمبر: 229۔ (۱)

الایضاح فی شرح کنز الدقائق

کنز الدقائق اپنی جامعیت اور ترتیب وتہذیب کے ساتھ ساتھ حسن اختصار کی وجہ سے یوم تصنیف سے لے کر تا حال ہمیشہ ہی ارباب قلم کا منظور نظر رہا ہے اور مختلف اہل علم نے اپنے اپنے دور میں اس پر قلم اٹھایا ہے اور درجنوں شروحات وحواشی معرض وجود میں آچکے ہیں، جن میں سرفہرست البحر الرائق، تبیین الحقائق، رمز الحقائق، النہر الفائق مشہور شروحات ہیں، انہیں شروحات میں ایک شرح علامہ محمد یحی قوجحصاری کی الایضاح فی شرح کنز الدقائق ہے، جو ایضاح الکنز کے نام سے معروف ہے، اور اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، یہ ایک متوسط؛ لیکن مکمل شرح ہے، اس کے اندر مصنف نے ہر مسئلہ کو اختصار کے ساتھ سہل زبان میں بیان کیا ہے، اگر کسی مسئلہ میں ابہام ہے تو اس کو واضح کیا ہے، اگر کہیں مثال کی ضرورت پڑی ہے تو مثال دے کر مسئلہ کو بیان کیا ہے، نیز اس شرح کو لکھنے میں مصنف نے ہدایہ، کافی شرح وافی، ایضاح کرمانی، اسرار الدبوسی، المحیط، المحصول من اصول الفقہ، شروح الجامع الصغیر، المنافع، المستصفی، ملتقی البحار، شروح المنظومہ اور شروح الجامع الکبیر سے استفادہ کیا ہے، جیسا کہ مصنف نے اس کتاب کے مقدمہ میں صراحت کیا ہے (۲)، اس کتاب کا مخطوطہ درج ذیل مکتبات میں ہیں:

1- مکتبہ ولی الدین جار اللہ آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: -692-694۔

2- نیشنل لائبریری پیرس، فرانس، مخطوطہ نمبر: 902۔

3- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1613۔

---

(۱) الفہرس الشامل: 8/ 239-236، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث - فہرس مخطوطات: 50/ 873، معجم تاریخ التراث الاسلامی لفواد سزکین: 1/ 485۔

(۲) دیکھئے: ایضاح الکنز، مقدمہ، ص: 1، مخطوطہ جار اللہ آفندی، ترکی۔

4- مکتبہ ظاہریہ، دمشق، شام، مخطوطہ نمبر: 9033۔

5- دارالکتب الوطنیہ، تونس، مخطوطہ نمبر: 5784۔ (۱)

فصول العمادی (الفصول العمادیہ)

فصول العمادی فقہ حنفی میں ایک بہت ہی عمدہ، نفیس اور اچھی کتاب ہے، جو دعوی، قضاء، معاملات اور فصل خصومات سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے، اس کتاب کا اصل نام ''فصول الاحکام فی اصول الاحکام'' ہے، اور ''فصول العمادی یا الفصول العمادیہ'' سے مشہور ہے، اس میں کل چالیس فصلیں ہیں، اور ہر فصل میں اُس فصل سے متعلق مسائل کو بہت ہی سلیقہ سے یکجا کر دیا گیا ہے، نیز ہر مسئلہ کا ماخذ بھی ذکر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، علامہ لکھنویؒ اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور اسے بہت ہی عمدہ اور نفیس مجموعہ پایا ہے، جو متفرق احکام اور مختلف فوائد پر مشتمل ہے (۲)، ابن قاضی سماونہ لکھتے ہیں کہ فصل خصومات اور دعاوی کے باب میں جو بھی فتاوی یا مجموعہ تیار کی گئی، اس میں ''فصول العمادی'' اور ''فصول الاشتروشنی'' سب سے عظیم اور نفع بخش کتاب ہے۔ (۳)

مصنفؒ اس کتاب کے متعلق مقدمہ میں لکھتے ہیں: ''میں نے اس قرطاس میں جو کہ مقدار کے اعتبار سے چھوٹی ہے مگر قدر و منزلت کے اعتبار سے بڑی ہے، اسلامی فوائد پر مشتمل عمدہ باتوں اور مستحکم فوائد کے تابدار موتیوں کو متعدد مقبول کتابوں سے نقل کر کے اور متعدد چنیدہ کتابوں سے انتخاب کر کے جمع کیا ہے، میں نے یہ باتیں مختصر اور جامع عبارت میں بڑے اور عمومی افادات کے ساتھ نقل کی ہیں، میں نے اس میں اصحاب فہم و دانش کے سامنے اپنے افکار و خیالات پیش کیے ہیں، جیسا کہ مخاطبین کے سامنے افکار و خیالات پیش کیے جاتے ہیں، میں نے سمعی و عقلی دلائل و مباحث پر مشتمل اس منتخب مجموعے کو ''فصول الاحکام فی اصول الاحکام'' کا نام دیا ہے، وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہر فصل ایسے اصول پر مشتمل ہے جس کی مختلف ذیلی فصلیں نکلتی ہیں، اس دیدہ ریزی اور دل سوزی کے پیچھے میرا مقصد اپنے آپ کو اور تمام مسلمانوں اور عام مومنوں کو نفع پہنچانا ہے، میں اس بابت

---

(۱) الفہرس الشامل: 1/ 727، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث - فہرس مخطوطات: 48/ 649، معجم تاریخ التراث الاسلامی لفواد سزکین: 5/ 3955۔

(۲) الفوائد البہیہ، ص: 94۔

(۳) جامع الفصولین: 1/ 2۔

اللہ سے بہتر خیر کا اور استفادہ کنندگان سے نیک دعاؤں کا امیدوار ہوں، میرا رب میرے لیے کافی ہے، اور وہی بہتر کارساز ہے"۔ (۱)

سوانح وفہرست نگاروں کا مصنف کے نام کے سلسلہ میں قدرے اختلاف ہے، بعضوں کا خیال ہے کہ اس کتاب کا مصنف جمال الدین بن عماد الدین ہے، لیکن محقق اہل علم نے اس کا مصنف ابوالفتح عبدالرحیم بن ابوبکر ابن عبدالجلیل مرغینانی سمرقندی کو قرار دیا ہے اور یہی رائے صحیح ہے؛ چونکہ مصنف علامہ مرغینانی کے پوتے اور علامہ نظام الدین کے بھتیجے ہیں، جیسا کہ مصنف کے اس لفظ "قال جدی برہان الدین" اور "قال عمی نظام الدین" سے معلوم ہوتا ہے، بہرحال آپ صاحب ہدایہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس کتاب کی تکمیل شعبان 651ھ میں سمرقند کے اندر ہوئی، اور آپ کا انتقال 670ھ میں ہوا۔ (۲)

فتاوی ہندیہ میں اس کتاب کے بڑی تعداد میں حوالے موجود ہیں، جس سے اس کتاب کی اہمیت معلوم ہوتی ہے، اس کتاب پہ تحقیق وتعلیق کا کام جامعہ اردن کے قسم الدراسات العلیا لعلوم الشریعہ کے طلباء نے کیا ہے؛ لیکن اب تک زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر نہیں آئی ہے، اس کتاب کا مخطوطہ دنیا کے مختلف مکتبات میں موجود ہیں، جن میں سے بعض کی تفصیل درج ذیل ہیں:

1- مکتبہ حکیم اوغلو پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 376۔
2- مکتبہ عاطف آفندی، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1162۔
3- مکتبہ دارالعلوم دیو بند- انڈیا، محفوظہ نمبر: [72/308]۔
4- رضالائبریری، رامپور- انڈیا، محفوظہ نمبر: [M5300(2346)]۔
5- مکتبہ شہید علی پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 903۔ (۳)

الغایہ شرح الہدایہ

ہدایہ کی شروحات میں غایۃ السروجی کا ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور اسے فقہ حنفی میں ایک قیمتی اور

(۱) فصول العمادی، ص:2، مخطوطہ۔

(۲) الفوائد البہیہ، ص: 94، کشف الظنون: 2/ 1270، ہدیۃ العارفین: 1/ 560، معجم تاریخ التراث الاسلامی لفواد سزگین: 3/ 1711۔

(۳) الفہرس الشامل: 6/ 397۔

معتبر مرجع شمار کیا گیا ہے، اس کے مصنف مشہور فقیہ احمد بن ابراہیم بن عبد الغنی سروجی ہیں، شروع میں آپ حنبلی مسلک کے پیروکار تھے، پھر مسلک احناف سے وابستہ ہو گئے، آپ اصول وفقہ کے امام اور معقول ومنقول میں شیخ زمانہ تھے، اپنے وقت کے درلاثانی تھے، فقہ وفتاوی میں اپنی مثال آپ تھے، ایک لمبے عرصہ تک مصر کے قاضی ومفتی اور مدرس کا فریضہ انجام دیتے رہے، اور متعدد مفید واہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں کتاب ادب القضاء، کتاب المناسک، کتاب ''نفحات النسمات فی وصول الثواب الی الاموات'' وغیرہ مشہور تصانیف ہیں، بڑے بڑے اکابر آپ کے علم قائل تھے، علماء احناف کے علاوہ دوسرے مکتب فکر کے مشائخ نے بھی آپ کے علم کا اعتراف کیا ہے، جن میں سرفہرست علامہ ابن تیمیہؒ، حافظ ذہبیؒ، حافظ ابن حجرؒ، حافظ ابن کثیرؒ، علامہ مقریزیؒ وغیرہ ہیں(۱)، جب آپ نے ہدایہ کی شرح ''غایۃ السروجی'' لکھنا شروع کیا تو زندگی نے وفانہیں کی اور کتاب الایمان ہی تک پہونچے تھے کہ خدا کا بلاوا آ گیا، اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، پھر اس شرح کا تکملہ کا کام قاضی القضاۃ سعد الدین بن شمس الدین الدیری نے شروع کیا اور اس میں انہوں نے علامہ سروجی کے اسلوب اور منہج کو اپنایا؛ لیکن وہ بھی کتاب السیر ، باب المرتد تک ہی لکھ سکے، پھر اس کام کو محمد بن احمد قونوی نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا، اور اس کا نام ''تکملۃ الفوائد'' رکھا۔(۲)

اس کتاب کی خصوصیات میں درج ذیل باتیں شامل ہیں:

● اپنے مسلک کے مسائل کو ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دلائل کو بھی ذکر کرتے ہیں، ساتھ ہی دوسرے ائمہ (امام مالک، امام شافعی، امام احمد وغیرہم) کے اقوال اور ان کے مستدلات بھی بیان کرتے ہیں، اس اعتبار سے اس کتاب کا شمار فقہ مقارن میں بھی ہوتا ہے۔

● اس کتاب میں احادیث، آثار صحابہ اور اقوال تابعین بکثرت نقل کئے گئے ہیں۔

● احادیث کو ذکر کرنے کے بعد اس پر کلام بھی کرتے ہیں اور علت بھی بیان کرتے ہیں۔

● بعض مسائل میں دلائل کی بنیاد پر ترجیح بھی ذکر کرتے ہیں اور اس کو ان الفاظ سے بیان کرتے ہیں ھوالصحیح، ھوالاصح، ھوالاشبہ وغیرہ۔

---

(۱) **بيان تلبيس الجهميه في تأسيس بدعهم الكلاميه**: 1 / 6، نیز دیکھئے: ذیل تاریخ الاسلام، ص: 86، الدرر الکامنہ: 104/1، البدایہ والنہایہ: 18 / 107، المقفیٰ: 1 / 348۔

(۲) الاثمار الجنیہ: 1 / 308، نیز دیکھئے: تاج التراجم: 1 / 108، کتائب اعلام الاخیار: 2 / 269، کشف الظنون: 2 / 2022، الجواہر المضیہ: 1 / 53، الطبقات السنیہ، ص: 76، الفوائد البہیہ، ص: 13، ہدیۃ العارفین: 1 / 104، معجم المؤلفین: 1 / 140۔

● مسائل حنفیہ کو مسلک احناف کے علماء کی کتابوں سے اور دوسرے مسالک کے مسائل کو ان مسالک کے علماء کی کتابوں سے نقل کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں

● علماء کی ایک بڑی جماعت نے اپنی تصنیفات میں اس کتاب سے استفادہ کیا ہے، فتاوی عالمگیری میں اس کے سو سے زائد مسائل منقول ہیں، الحمد للہ اس کتاب پہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں شیخ عدنان بن فہد العبیات کی زیر نگرانی تحقیقی کام ہوا ہے، اور کتاب الایمان تک پندرہ جلدوں میں دار الاسفار کویت سے 2021ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔

شرح مختصر الوقایہ لابی المکارم

برہان الشریعہ نے اپنے پوتے کو فقہ پڑھانے کے لئے ایک مختصر کتاب وقایہ کے نام سے لکھی، بڑے ہوکر پوتے نے اس کی شرح بھی لکھی اور اس کا اختصار بھی کیا، یہ شرح شرح الوقایہ کے نام سے معروف ہے اور مدارس اسلامیہ کے نصاب میں داخل ہے، اور اختصار مختصر الوقایۃ کے نام سے مشہور اور نقایہ کے نام سے موسوم ہے، چنانچہ جس طرح دیگر اہل علم نے اس کتاب کی شرح لکھی ہے، شیخ ابوالمکارم بن عبداللہ بن محمدؒ نے بھی اس کی ایک جامع شرح لکھی ہے، اگرچہ یہ شرح اہل علم کے درمیان اتنی پذیرائی حاصل نہیں کرسکی، جتنی ملا علی قاری، علامہ شمنی، علامہ برجندی وغیرہ کی شروح نے حاصل کی، بلکہ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے شیخ ابوالمکارم کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک غیر معروف مصنف ہیں، اور ان کی کتاب بھی غیر معروف ہے، علامہ لکھنوی نے اس شرح کو غیر معتبر کتابوں میں شمار کیا ہے۔[۱]

اس کے باوجود اس کتاب سے متعدد اہل علم نے استفادہ کیا ہے، جن میں علامہ علاء الدین حصکفیؒ، شیخی زادہ صاحب مجمع الانہر، علامہ ابن عابدین شامی، علامہ شرنبلالی، یوسف بن عمر صاحب جامع المضمرات وغیرہ قابل ذکر ہیں، فتاوی عالم گیری میں بھی اس سے متعدد مسائل لئے گئے ہیں۔

مصنف علیہ الرحمہ اس شرح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں مختصر الوقایہ پر ایک حواشی لکھوں جو پس پردہ وجوہ وفوائد کو سامنے لانے والی ہو، علم کے پیاسوں کے لیے سیرابی کا ذریعہ ہو، میری جانب سے اہل علم کے لیے ایک یادگار تحفہ ہو اور مخلصین کے لیے ایک سوغات ہو، لہٰذا میں نے

(۱) دیکھئے: تنقیح الفتاوی الحامدیہ: 324/2، دفع الغوایہ للکنوی، ص:39، کشف الظنون: 1972/2۔

اس کام کو اللہ تبارک وتعالی کی توفیق سے شروع کر دیا اور اس میں ایسے مسائل کا اضافہ کیا جس کی خاطر خواہ ضرورت محسوس ہوئی اور ان مسائل کو معتمد اہل کتابوں سے نقل کیا اور حتی المقدور اس طرف بھی اشارہ کیا کہ فتوی دینے کے لیے کونسا قول بہتر اور پسندیدہ ہے۔(۱)

مصنف نے اس کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ میں نے یہ شرح رجب 907ھ میں مکمل کی(۲)، یہ شرح کتاب الطہارہ سے شروع ہوا ہے اور کتاب الخنثی پر ختم ہے، یہ شرح اب تک مخطوطہ ہے، جس کا قلمی نسخہ ان مکتبات میں ہیں:

1- مکتبہ حکیم اوغلو پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 376۔
2- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، مخطوطہ نمبر: 1658۔
3- مکتبہ دار العلوم دیو بند- انڈیا، محفوظہ نمبر: [72/308]۔
4- خدا بخش لائبریری، پٹنہ- انڈیا، محفوظہ نمبر: 1668-1670۔
5- مکتبہ شہید علی پاشا، ترکی، مخطوطہ نمبر: 903۔(۳)

کتاب الفصول (فصول الاستروشنی، الفصول الاستروشنیہ)

یہ کتاب مجد الدین ابو الفتح محمد بن محمود بن حسین الاستروشنی المتوفی 632ھ کی تصنیف ہے، فقہ حنفی میں یہ ایک بہت اچھی اور عمدہ تصنیف ہے، جس میں مصنف نے دعوی اور قضاء اور فصلِ خصومات سے متعلق مسائل کا ایک بڑا حصہ جمع کر دیا ہے، اس سے مصنف کی قابلیت اور مسائل پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے، حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ آپ فقہ وفتاوی کے بڑے عالم اور بحر بیکراں تھے، مصنف نے پوری کتاب کو تیس فصلوں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر مسئلہ کو کسی نہ کسی کتاب کے حوالہ کے ساتھ نقل کیا ہے، کتاب کی ابتداء قضاء کے مسائل سے ہوئی ہے، اور اس فصل میں نکاح وطلاق اور معاملات سے متعلق ایسے مسائل کو یکجا کیا ہے، جو معاشرہ اور سماج میں کثیر الوقوع اور زیادہ پیش آتے ہیں، اور قضاء کے باب میں اس کی بڑی اہمیت ہے، پھر ہر فصل سے متعلق مسائل کو بڑے ہی خوبصورتی ساتھ بیان کیا ہے، اور کتاب کا اختتام مسائل المتفرقات پر کیا ہے، اس کتاب کی تکمیل

---

(۱) شرح ابی المکارم، ص: 1، مخطوطہ مکتبہ نور عثمانیہ ترکی۔ (۲) الفہرس الشامل: 6/397۔
(۳) حوالۂ سابق۔

جمادی الاولی 625ھ میں ہوئی، اس کتاب کی تصنیف میں بتیس سال، سات مہینہ کا عرصہ صرف ہوا۔(۱)

اس کتاب سے مختلف اہل علم نے استفادہ کیا ہے، اور فتاوی عالم گیری میں اس کے متعدد مسائل منقول ہیں، یہ کتاب اب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، جسے شائع کرنے کی ضرورت ہے، اس کا مخطوطہ درج ذیل مکتبات میں محفوظ ہے:

1- مکتبہ نور عثمانیہ، ترکی، محفوظہ نمبر: 1773-1772۔
2- مکتبہ راغب پاشا، ترکی، محفوظہ نمبر: 572۔
3- مکتبہ دار العلوم دیو بند- انڈیا، محفوظہ نمبر: [92/328-329]۔
4- خدا بخش لائبریری، پٹنہ- انڈیا، محفوظہ نمبر: 1681۔
5- مکتبہ ینی جامع، ترکی، محفوظہ نمبر 529-527۔(۲)

فتاویٰ حمادیہ

فقہ حنفی میں فقہ و فتاوی کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے، چونکہ علماء احناف ہر دور میں منصب قضاء و افتاء سے وابستہ رہے، اور عوام کے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کام کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے رہے، ہندوستان کو بھی یہ شرف حاصل رہا کہ یہاں کے اہل علم نے تفسیر، حدیث، اصول وفقہ اور تمام اسلامی علوم میں عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس کا اعتراف پوری دنیا کو ہے، بطور خاص فقہ وفتاوی پر یہاں زیادہ توجہ دی گئی، کیونکہ فقہ کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے، اور احکام شریعت سے واقفیت کی ضرورت عوام اور حکومت ہر ایک کو ہے، لہذا یہاں اہل علم کے ساتھ ساتھ مسلم حکومتوں نے بھی تدوین فقہ وفتاوی پر خصوی توجہ دی اور اہل علم سے اس سلسلہ میں خدمات حاصل کیں، اسی سلسلہ کی ایک فتاوی کا مجموعہ ''فتادی حمادیہ'' ہے جو باوجود مختصر ہونے کے اپنے اندر بڑی جامعیت رکھتا ہے اور اس کی ترتیب بہت عمدہ ہے، اس کو معروف صاحب علم ابوالفتح رکن الدین بن حسام الدین ناگوری نے اپنے بیٹے مولانا داؤد کے ساتھ مل کر مرتب کیا ہے، فتاوی کا یہ مجموعہ قاضی القضاۃ حماد الدین گجراتی بن قاضی محمد اکرم گجراتی کی خواہش پر مرتب کیا گیا ہے اور اور ان ہی کی طرف اس کتاب کی نسبت

(۱) کشف الظنون: 19، 1266؛ ہدیۃ العارفین 2/113؛ الفوائد البھیۃ 200؛ الزرکلی: 7/307؛ معجم المؤلفین: 11/317، معجم تاریخ التراث الاسلامی لفواد سزکین: 5/3220، سلم الوصول الی طبقات الفحول: 3/261۔

(۲) الفہرس الشامل: 6/397۔

ہے،اس کتاب میں تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کی دوسو چار کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے اوران سے اہم فقہی مسائل جمع کئے گئے ہیں (۱)، اس فتاوی کی ترتیب اس ناحیہ سے بھی بڑی عمدہ اور نفیس ہے کہ مصنفؒ ہر نئے باب کے ساتھ اس کے فضائل میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں، پھر مسائل وجزئیات کو بیان کرتے ہیں، نیز جن کتابوں سے انہوں نے مواد جمع کیا ہے، ان کا نام ہر مسئلہ کے شروع میں ذکر کردیتے ہیں، مصنف نے کتاب کے مقدمہ میں ان تمام کتابوں کا بھی تذکرہ کردیا ہے جن سے انہوں نے استفادہ کیا ہے، یہ کتاب صرف ایک بار کلکتہ سے 1241ھ میں طبع ہوئی تھی، لیکن اب اس کا مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہے، لیکن اس کے کئی مخطوطے برصغیر اور مصر وغیرہ میں دستیاب ہیں، فتاویٰ عالمگیری اور دوسری کتابوں میں اس کے بکثرت حوالے ملتے ہیں، اس کتاب کو ازسرنو طبع کرنے کی ضرورت ہے، بعض مکتبات کی تفصیل درج ذیل ہے:

1- رضالائبریری رامپور، انڈیا، مخطوطہ نمبر: [D-14051(2477)]۔

2- معہد الابحاث العربیہ والفارسیہ، ٹونک، انڈیا، مخطوطہ نمبر: [T-723(955)]۔

3- مکتبہ دارالعلوم دیوبند، انڈیا، مخطوطہ نمبر: 70/306۔

4- مکتبہ جامعہ الازہر، مصر، مخطوطہ نمبر: 33209۔

5- خدابخش لائبریری، پٹنہ، انڈیا، مخطوطہ نمبر: 1723۔ (۲)

○○○

(۱) نزہۃ الخواطر: 3/247-250، معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ: 2/1836، فتاوی حمادیہ، ص: 1، مخطوطہ: مکتبہ جامعہ ازہر، مصر۔

(۲) الفہرس الشامل: 6/486، نیز دیکھئے: خزانۃ التراث-فہرس مخطوطات: 48/859، فہرس الازہر: 6/281۔

اسلامی موضوعات پر انگریزی زبان میں ہندوستانی غیر مسلم دانش وروں کی اہم تصنیفی خدمات

مولانا محمد اعظم ندوی ❖

انگریزی زبان میں اسلامی موضوعات پر غیر مسلم ہندوستانی مصنفین کی مثبت اور منفی دونوں قسم کی کتابیں موجود ہیں، افسوس کہ اب منفی سوچ کی حامل کتابیں روایتی اور برقی بازار کتب میں زیادہ دستیاب نظر آتی ہیں، میں نے اپنے اس مختصر مقالہ میں درج ذیل موضوعات سے متعلق اہم کتابوں کا ایک تعارف کرانے کی کوشش کی ہے:

۱-قرآنیات۔

۲-سیرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

۳-اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب۔

۱-قرآنیات

بنارس ہندو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی، اور اسی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے وابستہ رہے مشہور قلم کار یو جی سی ریسرچ سائنٹسٹ ڈاکٹر وزیر حسن کی کتاب The Study of the Quran by Non-Muslim Indian Scholars آدم پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، دہلی سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی، ڈاکٹر وزیر نے اپنی اس کتاب میں انگریزی میں قرآنیات پر چھ کتابوں کا ذکر کیا ہے:

❖ استاذ: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

1-Khuda-Quranic Philosphy by R.B. Harishchandra.(۱)

2-Gita and the Quran by Pandit Sunder Lal.

3-Congruencies of fundamentals in the Qur'an and Bhagvat Gita by Mister Mukundan.

4-The Essence of Qur'an by Vinoba Bhave.

5-Selections from the Qur'an compiled by O.P. Ghai.

6-Christ in the Qur'an and Bible by Bandi Sreenivas Rao.(۲)

۱-پہلی کتاب جس کا عنوان ہے:'خدا-قرآنی فلسفہ'، جناب ر۔بی ہریش چندر کے قلم سے ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب قرآنی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ہے، مصنف نے روح کی تخلیق، اللہ کی شان، حکمت، علم، اللہ کی وحدانیت، اوراس کی صفات وغیرہ پر بحث کی ہے۔

۲-دوسری کتاب جواس باب میں جگہ پاتی ہے وہ پنڈت سندر لال کی لکھی ہوئی 'گیتااورقرآن' ہے، اس تصنیف میں مصنف نے گیتا کے ساتھ ساتھ قرآن کی ضروری تعلیمات کو بھی بیان کیا ہے، اس کے ساتھ ہی، مؤلف نے اپنے نظریہ وترجیح کے مطابق یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ دونوں اپنی بنیادی تعلیمات میں ایک دوسرے سے کتنی مشابہت رکھتی ہیں۔

۳-تیسری کتاب جو براہ راست قرآن سے متعلق ہے وہ ہے 'قرآن اور بھگوت گیتا میں بنیادی باتوں کی مطابقت'، یہ کتاب مسٹر مکندن نے لکھی ہے، یہ کتاب ان دونوں کتابوں میں موجود مشترک معلومات وتعلیمات سے بحث کرتی ہے۔

۴-چوتھی کتاب ونا یک نرہاری بھاوے جی (و:۱۹۸۲ء) کی ہے، جو ونوبا بھاوے سے مشہور ہیں، کتاب کا نام The Essence of Qur'an ہے، یعنی 'جوہر قرآن یاروح قرآن' ہے، ونوبا بھاوے جدید ہندوستان کے عظیم روحانی رہنماؤں اور سماجی مصلحین میں سے ایک تھے، جو گاندھی جی کے روحانی جانشیں Spiritual Successor مانے جاتے ہیں، جن کے کارناموں نے وزرائے اعظم سے لے کر غریبوں تک تمام ہندوستانیوں کے دلوں کو متاثر کی، یہ ونوبا کی پسندیدہ قرآنی آیات کا انتخاب ہے، لیکن انتہائی فلسفیانہ اورعملی نوعیت کی ہے، اسے پورے قرآن کے خلاصہ کی شکل کی ایک کتاب قرار دیا جا سکتا ہے، آچاریہ ونوبا بھاوے

---

(۱) Parichay Overseas, 1979

(۲) The Study of the Quran by Non-Muslim Indian Scholars, P317-18

نے پچیس سال قرآن کا مطالعہ کیا، اور پھر یہ کتاب پیش کی، جس کا تازہ ایڈیشن ۲۰۱۹ء میں Sarva Seva Sangh Prakashan سے شائع ہوا ہے، جیسا کہ خود مؤلف نے اپنے پیش لفظ میں کہا ہے: ''اس کی تالیف کا مقصد انسانوں کے دلوں کو جوڑنا ہے''، یہ کتاب انسانیت کے روحانی علوم میں ایک قیمتی اضافہ ہے، ونوباجی نے قرآن کے حقیقی پیغام کو اجاگر کرنے کے لیے منتخب آیات کو مناسب عنوانات کے تحت مرتب کیا ہے، یہ کتاب دراصل ان کی مادری زبان مراٹھی میں تھی، بعد میں اس کا انگریزی ترجمہ ہوا[۱] جبکہ دنیا کی اور بھی مشہور زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔

۵- پانچویں نمبر پر او پی گھائی کی مرتب کردہ کتاب 'قرآن سے انتخاب' ہے، یہ بھی انتہائی عملی نوعیت کی قرآنی آیات کا مجموعہ ہے، یہ کتاب قرآن کے فلسفہ اور تعلیمات کو ایک نظر میں اجاگر کرنے کی کوشش ہے۔

۶- چھٹی کتاب کا عنوان ہے 'قرآن اور بائبل میں مسیح'، یہ کتاب بندی سری نواس راؤ نے لکھی ہے، یہ کام قرآن کے ذریعہ مسیحی عقیدے کی سچائی کو ثابت کرنے کی کوشش ہے، اس کے علاوہ مؤلف نے اس کی وجہ اپنے نقطۂ نظر کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب بائبل خدا کی سابقہ وحی کے طور پر پہلے سے موجود تھی تو قرآن کیوں نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا؟

ان کے علاوہ اور بھی اہم کتابیں ہیں جن میں ہم ڈاکٹر این کے سنگھ کی Encyclopaedia of the Holy Qur'an کو بجا طور پر شامل کر سکتے ہیں، جو ۵ رجلدوں میں ہے، قرآن پاک کا یہ جامع انسائیکلو پیڈیا بین الاقوامی مرکز برائے مذہبی مطالعات سے شائع ہوا ہے، جس میں عصر حاضر کے تقاضوں کو نظر میں رکھتے ہوئے تقریباً 300 اہم موضوعات کو تلاش کیا گیا ہے، مرتب کا تعارف ہم سیرت کے ذیل میں کریں گے۔[۲]

۲- سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

غیر مسلم بھارتی قلم کاروں کے ذریعہ انگریزی زبان میں سیرت رسول کی تصنیف کا آغاز:

۱- ۱۸۹۲ء میں امریکی مؤرخ اور سوانح نگار واشنگٹن اِرونگ Washington Irving (و:۱۸۵۹ء) کی کتاب Life of Mahomet (حیات رسول) کے ترجمے سے ہوا، یہ ترجمہ سناتن دھرم پرچارک (امرتسر) نامی اخبار کے بانی لالہ رلیارام گولاٹی نے ''سوانح عمری محمدؐ'' کے نام سے کیا تھا، جو مطبع اروڑ بنس، لاہور سے شائع

---

(۱) https://www.newageislam.com/a/books-and-documents

(۲) https://www.amazon.in/Encyclopaedia-Holy-Quran-Vols-set/dp/B01HMH68FE

ہوا تھا، ڈاکٹر انور محمود خالد رقم طراز ہیں: ''ہندی غیر مسلموں کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی حمایت میں خود کتب سیرت لکھنے یا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرنے کی ابتدا بھی انیسویں صدی کے آخر میں ہوئی، جس کی ایک مثال لالہ رلیا رام گولاٹی کی ''سوانح عمری محمد'' (۱۸۹۲ء) ہے''[1]۔ اس کے بعد سید افتخار حسین شاہ کی کتاب 'ارمغان حق' کے حوالہ سے حاشیہ میں لکھتے ہیں: ''یہ کتاب واشنگٹن اِروِنگ Washington Irving کی کتاب Life of Mahomet کا اردو ترجمہ ہے''، اس کتاب کو میں انگریزی کتابوں کی فہرست میں شامل کر رہا ہوں، چونکہ ترجمہ بھی تصنیف کی ایک قسم ہے، اور مترجم بھی آدھا مصنف ہوتا ہے۔

۲- پروفیسر کے۔ ایس راما کرشنا راؤ مراٹھی آرٹس کالج برائے خواتین میسور کے شعبۂ فلسفہ میں استاد اور صدر شعبہ رہے ہیں، انہوں نے The Prophet of Islam: Mohammad کے نام سے ایک کتابچہ تصنیف کیا ہے، کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے، اردو میں اس کا ترجمہ ''اسلام کے پیغمبر محمد ﷺ'' کے عنوان سے نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی سے شائع ہوا، میرے سامنے اس کا ۳۶ صفحات پر مشتمل وہ نسخہ ہے جو World Assembly of Muslim Youth (وامی، سعودی عرب) سے شائع ہوا ہے، مقدمہ پر ۵/اپریل ۱۹۸۹ء کی تاریخ درج ہے، اس کتاب کے منصفانہ مطالعہ کا اندازہ اس کے درج ذیل عناوین سے ہوسکتا ہے:

1-The Prophet-A Historic Personality (پیغمبر-ایک تاریخی شخصیت)

2-War for self-Defence (شخصی دفاع کے لیے جنگ)

3-Peasant and king equal before God (خدا کے نزدیک کسان اور بادشاہ برابر)

4-Pilgrimage-Haj- A living testimony (حج-ایک زندہ گواہی)

5-Islam-A beacon to a drifting world (اسلام بدلتی دنیا کے لیے ایک مینارۂ نور)

6-Islam-Emancipited women (اسلام نے خواتین کو آزادی دی)

7-Women has to right to own property (خواتین کو جائیداد کی مالک بننے کا حق حاصل ہے)

راما کرشنا راؤ لکھتے ہیں:

> ''An honest man, as the saying goes, is the noblest work of God. Muhammed was more than honest. He

---

(۱) اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ، ڈاکٹر انور محمود خالد، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۹ء، ص ۴۶۸

was human to the marrow of his bones. Human sympathy, human love was the music of his soul. To serve man, to elevate man, to purify man, to educate man, in a word, to humanise man–this was the object of his mission, the be-all and end-all of his life. In thought, in word, in action he had the good of humanity as his sole inspiration, his sole guiding principle.'' (25)

(ایک ایماندار آدمی، جیسا کہ کہا جاتا ہے، خدا کا سب سے عظیم کام ہے، محمد صرف ایماندار سے آگے کے انسان تھے، وہ اپنی ہڈیوں کے گودے تک انسان تھے، انسانی ہمدردی اور انسانی محبت ان کی روح کی موسیقی تھی، انسان کی خدمت کرنا، انسان کو بلند کرنا، انسان کا تزکیہ کرنا، انسان کو تعلیم دینا، ایک لفظ میں انسان کو انسان بنانا، یہ پوری زندگی ان کے مشن کا مقصد تھا، فکر ونظر اور قول وعمل میں انسانیت نوازی ان کا واحد الہام، اور ان کا واحد رہنما اصول تھا)۔

اس کتاب کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، مصنف نے اپنے کتابچہ میں جہاں ایک طرف غیر متعصب مغربی مصنفین اور مستشرقین کے حوالے دیئے ہیں، دوسری طرف معتدل ہندو دانش وروں کے اقوال سے بھی استشہاد کیا ہے، مثلاً سروجنی نائڈو، مہاتما گاندھی، بسنت کمار بوس اور دیوان چند شرما وغیرہ، راما راؤ نے اللہ کے رسول ﷺ سے متعلق متعدد الزامات کی تردید کی ہے، مثلاً یہ الزام کہ محمد ﷺ نے اسلام کو تلوار کے ذریعہ پھیلایا، وہ کہتے ہیں کہ ایسے الزامات کی حیثیت ادبی اعجوبہ کاری سے زیادہ کچھ نہیں، انہوں نے آپ ﷺ کی تعلیمات میں جمہوریت اور مساوات کو خوب سراہا ہے، ان کے مطابق ان تعلیمات کے نتیجے میں بین الاقوامی اتحاد اور بھائی چارہ کے اصولوں کو آفاقی بنیادیں فراہم ہوئیں، عورت کو میراث میں حق دار قرار دیا گیا، بارہ صدیوں کے بعد انگلینڈ نے، جو جمہوریت کا مرکز کہلاتا ہے، عورت کے حقِ میراث کو ۱۸۸۱ء میں قانونی شکل دی، جب کہ سینکڑوں سال قبل پیغمبرِ اسلام نے عورتوں کو مردوں سے نصف حقِ میراث دلوایا تھا(۱)، وہ مزید کہتے ہیں: ''محمد ﷺ اپنے معاصرین کی نگاہ میں کھرے اور اعلیٰ کردار کے مالک

(۱) The Prophet of Islam: Mohammad، ص:۱۱

تھے، چنانچہ یہودی بھی آپ ﷺ کی صداقت کے قائل تھے، آپ کے کردار میں آپ کے معاصرین کو دھوکہ دہی، فریب کاری، یا دنیاوی مفاد پرستی کی ہلکی سی جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی''۔(۱)

۳- ڈاکٹر این ، کے ، سنگھ، انٹر نیشنل سنٹر فار ریلیجیس اسٹڈیز International Centre for Religious Studies دہلی کے ڈائرکٹر ہیں، جہاں سے 'گلوبل وژن' نامی سہ ماہی جرنل نکلتا ہے، جس کے وہ چیف ایڈیٹر بھی ہیں، ڈاکٹر این۔ کے سنگھ نے اسلامیات میں ماسٹر اور پی ایچ ڈی کی تھی، انہوں نے اسلامیات کو بحث وتحقیق کا موضوع بنایا ہے، Prophet Mohammad and His Companions کے نام سے انہوں نے سیرت نبوی اور سیرت صحابہؓ کی ایک جامع کتاب تصنیف کی ہے، اس کتاب کا واحد مقصد حضرت محمد ﷺ اور ان کے پچاس صحابہ کی زندگی اور مشن پر توجہ مرکوز کرنا ہے، جنہوں نے اسلام کی حفاظت اور تبلیغ میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں، اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: پہلا حصہ سیرت نبوی اور مشن سے متعلق ہے، دوسرا حصہ ان کے عقیدت مند ساتھیوں کی خدمات پر روشنی ڈالتا ہے، اس کتاب میں سیرت نبوی پر درج ذیل عناوین کے تحت گفتگو کی گئی ہے: عہدِ جاہلیت کی مذہبی اور سماجی صورت حال، پیغمبر کی ولادت اور بچپن، حلف الفضول میں شرکت، مذہبی بیداری کا آغاز، نزولِ وحی، مقصدِ بعثت، سماجی بائیکاٹ، واقعۂ معراج، ہجرتِ مدینہ، امت کی تشکیل، تعصب، عدم رواداری اور لادینیت کے خلاف محاذ آرائی، مصالحت کی کوششیں، آخری حج، وفات، اور امت کے لیے رہنما خطوط۔

فاضل مصنف نے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر بڑے متوازن انداز میں گفتگو کی ہے، کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''محمد ﷺ پیغمبر کا نام ایک جدید عہد کی تعمیر کے لیے جانا جاتا ہے۔ مذہبی حلقوں کے درمیان اس غیر معمولی شخص کا کردار بالکل صاف و شفاف ہے، محمد ﷺ بہ حیثیت انسان مر چکے ہیں، لیکن بہ حیثیت پیغمبر انہوں نے اپنے پیچھے قرآن وسنت کی شکل میں اثاثہ چھوڑا ہے، جو تعلیمات انہوں نے ہمارے واسطے چھوڑی ہیں اگر ان پر صدق دل کے ساتھ عمل کیا جائے تو اس دنیا میں ایک

(۱) ص: ۱۸-۱۹، دیکھئے مضمون: پیغمبر اسلام ﷺ ہندوستان کے غیر مسلم دانش وروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، سہ ماہی مجلہ بحث ونظر، حیدرآباد، اپریل۔ دسمبر ۲۰۱۶ء، ص: ۷۳

خوش گوار زندگی حاصل ہوسکتی ہے، اسلام اس دنیا کا ایک عملی مذہب ہے جو انسانیت کے دنیاوی مسائل سے دل چسپی لیتا ہے اور حل پیش کرتا ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ نے تمام اہل ایمان کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا تھا، اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''محمد ﷺ کا مذہب عوامی اور اجتماعی تھا، یہ کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص نہ تھا۔ چنانچہ اپنی اسی آفاقیت کے نتیجے میں تمام ایمان لانے والے ایک دوسرے کے عالمی طور پر بھائی تصور کیے گئے اور ان کے درمیان زبان، نسل یا طبقہ کی بنیاد پر امتیازی سلوک روا نہیں رکھا گیا اور برائی و بزرگی کی بنیاد خوفِ خدا اور تقوی قرار پائی''۔(۱)

عام طور پر یہ تأثر دیا جاتا ہے کہ عہدِ نبوی میں ہونے والی جنگوں میں زبردست کشت وخون ہوا، اور بے شمار انسانی جانیں ضائع ہوئیں، جناب این۔ کے سنگھ پرزور الفاظ میں اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دس سالہ زندگی کی ان تمام جنگوں میں صرف ڈھائی سو (250) غیر مسلموں کا قتل ہوا، جب کہ مسلمان اس سے بھی کم کام آئے، ان چند اموات کے طفیل پورے خطۂ عرب سے، جو لاکھوں مربع میل پر محیط ہے، انارکی اور بد کرداریوں کا خاتمہ ہوگیا، دس سال کی ان کوششوں کے نتیجے میں پورا جزیرۂ عرب اور عراق و فلسطین کے جنوبی حصے نے بہ خوشی اسلام قبول کرلیا''،(۲) تعداد کی قلت بیان کرنے میں گو کہ کچھ مبالغہ ہوگیا ہے، لیکن حقیقت بیانی قابل صد ستائش ہے، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب وغیرہ جیسے محققین کی تحریریں اس سلسلہ میں راہ نما ہیں۔

۳-اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب

۱۔ ٹی این مدن Triloki Nath Madan (پ: ۱۹۳۳ء) پروفیسر امیرٹس، سماجیات، انسٹی ٹیوٹ آف اکنامک گروتھ، دہلی یونیورسٹی، ایک ہندوستانی ماہر بشریات anthropologist ہیں، کئی کتابوں کے

---

(۱) Prophet Mohammad and His Companions، ص: ۱۰

(۲) ص: ۱۷، دیکھئے مضمون: پیغمبرِ اسلام ﷺ ہندوستان کے غیر مسلم دانش وروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی، سہ ماہی مجلہ بحث ونظر، حیدرآباد، اپریل۔ دسمبر ۲۰۱۶ء، ص: ۷۴

مصنف ہیں، جن میں ان کی مرتب کردہ کتاب Muslim Communities of South Asia: Culture, Society and Power زیادہ معروف ہوئی، کتاب کے تعارف میں بتایا گیا ہے:

> It then increasingly began to be felt that India's vast non-Hindu population, in particular its very sizeable Muslim community, needed to be studied of its own terms. This book is a reflection of this changing focus of research in the field.(۱)
>
> (یہ تیزی سے محسوس ہونے لگا کہ ہندوستان کی وسیع غیر ہندو آبادی، خاص طور پر اس کی بہت بڑی مسلم کمیونٹی، کا اس کی اپنی شرائط پر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب میدان تحقیق کے اس بدلتے ہوئے رجحان کی عکاس ہے)۔

۲-''ٹرین ٹو پاکستان'' کے مصنف مشہور نقاد اور مزاح نگار خشونت سنگھ (و:۲۰۱۴ء) بھی اسلامیات پر اچھی نظر رکھتے تھے، ان کی متعدد تحریریں اس کی گواہ ہیں، اقبال کی مشہور زمانہ نظم شکوہ جواب شکوہ کا انگریزی ترجمہ: SHIKWA & JAWAB-I-SHIKWA: Iqbal's Dialogue With Allah لکھ کر ساری دنیا سے دادو تحسین حاصل کی، اور یہ ان کی اسلامی تاریخ وتہذیب سے واقفیت کی بڑی دلیل ہے، اس لیے کہ علامہ محمد اقبال کی شاعری اور خصوصاً یہ نظمیں اسلامی تاریخ وتہذیب کی کامیاب ترجمانی کے طور پر دیکھی اور سمجھی جاتی ہیں۔

۳-اڑیسہ کے گورنر، مشہور رکن کانگریس، ''ہندو مندر اور اورنگزیب عالمگیر کے فرامین'' نامی کتابچہ کے مصنف ڈاکٹر بی-این پانڈے (و:۱۹۹۸ء) کی کتاب: Islam & Indian Culture بھی اس حوالہ سے ایک اہم کتاب شمار کی جاسکتی ہے، جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے پہلی بار ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی، ۸۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب دراصل خدا بخش کے سالانہ توسیعی خطبات کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۸۵ء میں پیش ہوئے، اس میں درج ذیل ۳/خطبات ہیں:

1-Confluence of Islam and Hinduism.(اسلام اور ہندومت کا سنگم)

2-Distortion of Medieval Indian History.(قرون وسطی کی ہندوستانی تاریخ کی تحریف)

3-The Legacy of Islam:A Panorama of Composite Culture.(اسلام کی میراث: جامع ثقافت کا ایک منظر)

---

(۱) T.N.Madan. 1995. Muslim Communities of South Asia: Culture, Society and Power. New Delhi: Manohar.

اس کا اردو ترجمہ جناب تقی رحیم صاحب نے ''اسلام اور ہندوستانی ثقافت'' کے نام سے کیا، جو خدا بخش سے ہی ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا، ۴۷ رصفحات پر مشتمل یہ ترجمہ بہت رواں اور شستہ ہے، فنون لطیفہ پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے مسلم عہد کی تعمیری یادگاروں کا بڑا حسین منظر پیش کیا ہے، لکھتے ہیں:

''مصوری ایک نازک پودا ہے، اور تعمیرات ایسا پرشکوہ درخت جو ثقافت کے کنج کو زینت بخشتا ہے، مغل شہنشاہوں نے جو آرٹ کا انتہائی پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، ان دونوں کو محبت بھری توجہ سے فروغ دیا، بابر نے رواں پانی، ابلتے ہوئے چشموں اور سنگ مرمر کے شہ نشینوں والے خوبصورت باغ لگائے، ہمایوں نے سات ایوانوں والا ایک محل کھڑا کیا، جن میں سے ہر ایوان ساتوں سیاروں میں سے ہر ایک کے نام پر معنون تھا، اکبر نے فتح پور سیکری کی تخلیق کی، جہانگیر نے سکندرہ میں اکبر کے مزار، اور آگرہ میں جہانگیری محل کی تکمیل اپنی نگرانی میں کرائی، ہندوستان کی تعمیراتی یادگاروں میں شاہ جہاں کی دین سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں، اپنے کثیر التعداد دالانوں کے ساتھ دلی کا لال قلعہ، حویلیاں اور مسجدیں، جامع مسجد، اور سب پر بالا لاثانی تاج محل اس کے ذوق کے لاثانی گواہ ہیں''۔(۱)

۴-لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی مشہور مصنفہ رومیلا تھاپر (پ:۱۹۳۱ء) Romila Thapar سابق ریڈر دہلی یونیورسٹی، چیئر پرسن قدیم تاریخ ہند، و پروفیسر امیرٹس جواہر لعل نہرو یونیورسٹی ، نے Somanatha The Many Voices of a History لکھی، اور سومناتھ پر پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کامیاب کوشش کی، جو Penguin Books سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی، اس پر کافی اعتراضات بھی ہوئے، ڈاکٹر ساجد علی لکھتے ہیں:

''رومیلا تھاپر نے محمود غزنوی سے منسوب کسی کارنامے سے انکار نہیں کیا، ان کی کتاب کا موضوع کچھ اور ہے، کیا سومناتھ پر حملہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مستقل نفرت کا بیج بو دیا اور اس کے بعد دونوں قوموں میں ایک دائمی عداوت کی بنیاد پڑ گئی؟ ان کی ساری تحقیق کا نتیجہ یہ ہے

---

(۱) اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۱۹-۲۰

کہ محمود کے ہندوستان پر حملے، مندروں میں لوٹ مار، بالخصوص سومناتھ پر حملہ
تاریخی تناظر میں اتنے اہم واقعات نہیں کیونکہ یہ اس زمانے کا معمول تھا، خود
ہندو راجے مہاراجے بھی مندروں پر حملے کرتے رہتے تھے، البتہ محمود کے ان
حملوں کے بیان کرنے میں ۔۔مورخین نے بہت مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے،
ان کے بیانات میں بہت سے تناقضات ہیں''۔(۱)

۵-اخیر میں اس سلسلہ کی ایک اہم کتاب کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اپنی اہمیت اور زمانۂ تصنیف میں یقیناً مقدم ہے،اور وہ کتاب ہے: Influence of Islam on Indian culture، یہ کتاب مشہور ہندوستانی مؤرخ اور ماہر آثار قدیمہ تارا چند(و: ۱۹۷۳ء) کی ہے،جس میں انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور روابط کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان پر اسلام کے احسانات اور اثرات سے بحث کی ہے،اس کتاب کا اردو ترجمہ''اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر'' کے نام سے چودھری رحم علی الہاشمی کے قلم سے ہے، جو آزاد کتاب گھر، دہلی سے شائع ہوا ہے،اس کتاب کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس کے بعد مسلمانوں کا اثر تیزی سے بڑھنے لگا،مسلمانوں کو ساحل ملیبار میں
آباد ہوئے سو سال سے اوپر ہو چکے تھے،تاجروں کی حیثیت سے ان کا خیر مقدم
کیا جاتا تھا، اور آبادکاری اور خرید اراضی اور اپنے مذہب پر علانیہ عمل کرنے کی
سہولتیں بہم پہنچائی جاتی تھیں،ان لوگوں نے آباد ہونے کے جلد ہی بعد تبلیغ مذہب
کی کوششیں شروع کردی ہوں گی؛ اس لیے کہ اسلام بنیادی طور پر تبلیغی مذہب
ہے، اور ہر مسلمان اپنے مذہب کا مبلغ ہے،ان میں بہتوں کی کافی عزت ووقعت
تھی، وہ ہندوستان میں شام کی عیسائی آبادی کی طرح نہیں آئے تھے، جو اپنے
ملک سے ستا کر نکالے گئے ہوں، بلکہ ان میں ایک نئے مذہب کا جوش اور فتحمندی
اور عظمت کا وقار تھا، نویں صدی کے ابھی زیادہ برس نہیں گزرے تھے کہ وہ
ہندوستان کے سارے مغربی ساحل پر پھیل چکے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے
مخصوص عقائد، اور طریق عبادت کی وجہ سے، نیز جس جوش کے ساتھ وہ اس کا

---

(۱) سومناتھ پر رومیلا تھاپر کی کتاب کا جائزہ، ڈاکٹر ساجد علی، www.humsub.com.pk/276130/sajid-ali-107

ادعا کرتے تھے اور جس طرح اس کی وکالت کرتے تھے، اس سے ہندو آبادی میں ایک ہلچل پیدا ہوگئی تھی''۔

آگے اس دور کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قدرۃ لوگوں کے دماغ پریشان تھے، اور نئے خیالات قبول کرنے پر خواہ وہ کہیں سے بھی آئے ہوں، ،آمادہ تھے، اسلام ایمان کے ایک سادے سے اصول، معین ومرتب عقائد ورسوم، اور سماجی نظام کے جمہوری نظریات کے ساتھ نظر آیا، اس سے مقامی فضا پورے طور پر متأثر ہوئی، اور نویں صدی کا ربع اول بھی نہیں گزرا تھا کہ ملیبار کا چیرامن پیرومال راجہ جو کریگنور میں حکومت کرتا تھا، نئے مذہب میں داخل ہوگیا''۔

اور وہ بھی متعدد اہم کتابیں اور مصنفین ہیں جن کا تذکرہ اس سیاق میں جگہ پا سکتا تھا، لیکن اختصار کے پیش نظر ان کتابوں کے تعارف پر اس احساس کے ساتھ اکتفا کیا جاتا ہے کہ:

ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا

المعہد العالی الاسلامی حیدر آبادؒ کی فکر اور اس کا مسلک

- اہل سنت والجماعت کے معتبر شارحین کی آراء پر استقامت۔
- اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ تینوں مکاتبِ فکر کا احترام۔
- عقیدۂ توحید میں ان تشریحات کی پابندی جو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اختیار فرمائی ہے۔
- سلفِ صالحین کے درمیان اعتقادی وفروعی مسائل میں جو اختلاف رائے رہا ہے، اس میں توسع اور ولی اللہی طرزِ فکر کی پیروی۔
- اہل قبلہ میں سے کسی گروہ کو کافر یا فاسق قرار دینے میں خوب احتیاط۔
- مخالف نقطۂ نظر کے مقابلہ میں تحمل، اختلاف رائے کے باجود احترام اور ملت کے مشترکہ مسائل کے لئے اشتراک۔
- علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ تزکیہ واحسان کی جامعیت۔
- برادرانِ وطن میں دعوتِ دین اور دفاعِ اسلام کی طرف خصوصی توجہ۔
- زبان وبیان اور سلوک ورویہ میں اعتدال۔
- مناظرہ اور طنز وتشنیع کی بجائے نصح ومحبت کے ساتھ اصلاح ودعوت۔

○○○

زیر تعمیر آڈیٹوریم، لائبریری اور دار التربیہ

مسجدِ معہد کی بالائی منزل کا دلکش منظر

RNI No: 1219775, RNI Tile-Code: APURD01946